مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

[illegible]

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

المکتبۃ الرحمانیہ
۱۸۔ بی ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
کتاب نمبر ____

سلسلۂ مطبوعات مجلس
۸۵

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

www.KitaboSunnat.com

مغربی ایشیا کے چھ مسلم اور عرب ممالک۔ افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن۔ کے ایک علمی، ثقافتی و دعوتی دورہ کی مفصل روداد و ڈائری، جس میں ان ممالک کی دینی، فکری، سیاسی اور اقتصادی صورت حال کی سچی تصویر اور وہاں کی دینی و اصلاحی تحریکات، متضاد عوامل و اثرات اور ذہنی و روحانی کشمکش کا دیانت دارانہ جائزہ آگیا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹ — بے ماڈل ٹاؤن - لاہور
نمبر 01527

بار سوم

۱۳۹۸ھ - ۱۹۷۸ء

کتابت .... ظہیر احمد کاکوروی
طباعت ... لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ (آفسٹ)
صفحات ۳۰۴
قیمت .... ۱۴ چودہ روپے

باہتمام

1050

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(دار العلوم ندوۃ العلماء)

دریائے کابل
سے
دریائے یرموک
تک

www.KitaboSunnat.com

عربی پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ء ترکی
اردو دوسرا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء لکھنؤ

www.Kitab. .unnat.com

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
حرفِ آغاز	۹	علماء کے وفد سے گفتگو	۳۴
مجاہدین اور مہاجرین کی سرزمین افغانستان میں	۱۳ تا ۱۴	وزراء اور دوسرے ذمہ داروں کی ملاقاتیں	۳۸
ہندوستان اور اسلام کی تاریخ میں افغانستان کا کردار	۱۵	قوم میں مغرب کے اثرات کی روز افزوں کمی اور اس کے نتائج	۴۰
افغانستان ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں	۱۸	کابل میں مجددی خاندان	۴۲
سفرِ افغانستان میں تاخیر	۲۲	چند علمی و دینی شخصیتیں	۴۴
رابطۂ عالم اسلامی کا وفد	۲۳	کابل کی جامع مسجد میں	۴۴
سرزمین کابل میں	۲۵	آثار قدیمہ اور باغات	۴۵
وزارت تعلیم کی ضیافت اور رہنمائی میں	۲۶	سلطان محمود غزنوی کے دار السلطنت میں	۴۶
تعلیمی و ثقافتی اداروں کا معائنہ	۲۷	علمی و تمدنی تاریخ میں غزنی کا حصہ	۴۷
تجدد پسند افغانی خواتین سے گفتگو	۳۰	غزنی کی بربادی	۴۸
افغانی خواتین میں جدید تہذیب و مستشرقین کے		حکمراں، حکام، زعماء اور شہنشاہوں کے مزارات پر	۴۹
افکار کے اثرات	۳۱	عبرت کا مقام	۵۱
بے چینی اور معاشرتی تمدن بگاڑ و قومی زوال کا نتیجہ	۳۲	ملک محمد ظاہر شاہ اور سردار داؤد خان	۵۲

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
سعودی رہنماؤں کی طرف سے اعزازی دعوت	۵۶	ایران دوستوں سے ایک سوال	۱۱۳
افغانی قوم کے انقلاب بحران کی قوت کا سرچشمہ	۵۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک	
قوموں کی زندگی میں شخصیت اور پیغام کی اہمیت	۶۱	نئے دور کا آغاز تھی جس نے تخت ایران کو ہلا دیا	۱۱۶
ذوقِ جمال اور رعنائی خیال کی سرزمین (ایران) میں	۷۷ تا ۱۲۹	مسئلہ صرف دین و لادینیت کا ہے	۱۲۲
		مشرق و مغرب کے سنگم لبنان میں	۱۲۴ تا ۱۶۲
ایران کی سیر کی دیرینہ آرزو	۷۹	اسلام کے داعیان اولین کے نقش قدم پر	۱۲۹
سفر کی تقریب	۱۰۰	نئے وفد کی تشکیل	۱۳۰
قیام ایران کی مدت	۸۰	بیروت میں	۱۳۱
وزراء اور علماء سے ملاقاتیں	۸۱	اسلامی اداروں اور بیروت کے مختلف علاقوں کا دورہ	۱۳۳
ایران کے دینی و تاریخی مقامات	۸۳	بیروت پر ایک نظر	۱۳۴
مجالس مذاکرہ اور استقبالیہ جلسے	۸۴	طرابلس میں	۱۳۸
طوس کی مردم خیز سرزمین پر	۸۵	ظہرانہ میں میری تقریر	۱۴۰
امام غزالی کی تربت پر	۸۶	ملاقات اور تعارف	۱۴۱
نادر شاہ افشار	۸۸	صیدا میں	۱۴۲
خلیفہ ہارون رشید کی یاد	۸۹	قوم میں علماء کا منصب و مقام اور عوام میں	
اصفہان	۹۰	ان کے بے اثر ہونے کے اسباب	۱۴۳
شیراز	۹۱	صیدا کا دورہ	۱۴۵
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد	۹۶	مفتی امین الحسینی کی میزبانی	۱۴۶

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
لبنانی مسلمانوں کی صورت حال پر ایک نظر	۱۴۹	ہارون رشید کے پایۂ تخت بغداد میں	۱۸۵ تا ۲۲۴
دارالافتاء میں ایک اعزازی تقریب	۱۵۲	اسلامی ثقافت و تاریخ میں بغداد کا مقام	۱۸۷
تہذیبوں کے تصادم اور عالمی اسٹیج پر مسلم قوم		بیروت سے بغداد	۱۸۹
کا کردار	۱۵۳	سرکاری ملاقاتیں اور دورے	۱۹۰
جن مقامات کو ہم نہیں دیکھ سکے	۱۶۰	دیوان الاوقاف کے اعزازی جلسے میں	۱۹۱
ملاقاتیں	۱۶۱	ایک قرن کا شکست کردہ صنم با نوشتہ	۱۹۲
سعودی سفارت خانہ کی جانب سے اعزازی تقریب	۱۶۲	بغداد یونیورسٹی، المجمع العلمی العراقی اور	
دو دن دمشق میں	۱۶۴ تا ۱۸۳	المجمع العلمی الکردی میں	۱۹۳
بیروت سے دمشق	۱۶۵	نئے تجربے	۱۹۵
دمشق سے میرا دیرینہ تعلق	۱۶۶	عراقی میوزیم ۔ تاثرات	۱۹۶
گذشتہ شام کے معاشرہ کی چند جھلکیاں	۱۶۷	ماضی کے کچھ نقوش اور یادیں	۱۹۷
اخیر دور میں شام کی زندگی اور حالیہ عربی انقلاب	۱۷۰	شیخ اگر اس وقت ہوتے	۱۹۸
دمشق میں	۱۷۳	اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر	
جامع اموی میں	۱۷۳	شیخ کا درد و کرب	۱۹۹
ملاقات	۱۷۴	عراق انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد	۲۰۰
شام کی زندگی میں کچھ نئی تبدیلیاں	۱۷۵	جامع الشہداء میں خطاب	۲۰۲
ملاقاتیں	۱۷۸	قرآن ایک صاف شفاف آئینہ جس میں	
خواب جو حقیقت تھا	۱۸۰	افراد اور قومیں اپنا بہروپ دیکھتی اور اپنا مقام پہچانتی ہیں	۲۰۳

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
بصرہ نہ دیکھنے کا افسوس	۲۱۳	شمالی سرحدوں پر تاثرات	۲۴۲
بغداد سے روانگی	۲۱۳	اربد میں تقریر: اسلام کے بارے میں	
شہیدوں اور پاسبانوں کی سرزمین اردن میں	۲۱۵ تا ۲۸۰	مسلمانوں کے نقطہائے نظر	۲۴۵
بغداد سے عمان	۲۱۶	مجاہد اسلامی عبدالحلبی کا انتقال اور ان کے	
وزارت اوقاف کی میزبانی	۲۱۸	کنبہ کی تعزیت	۲۴۷
محترم وزیر اوقاف اور ان کے رفقائے کار سے بات	۲۱۹	لہو ولعب اور تفریحات کا مرکز	۲۴۸
شاہ حسین سے ملاقات	۲۲۱	اصحاب کہف کے غار میں	۲۴۹
شہر کے اسلامی اداروں کا دورہ	۲۲۵	ایک اہم مجلس مذاکرہ میں شرکت	۲۵۰
فلسطینی پناہ گزینوں پر ایک نظر	۲۲۶	نوجوانوں کی بے چینی کے اسباب اور	
مرکز اسلامی کے استقبالیہ جلسہ میں	۲۲۷	اس کا علاج	۲۵۱
ایک سرحدی اور برسرپیکار اسلامی ملک کا وزیر اعظم	۲۲۸	عمان سے کرک	۲۶۵
موتمر اسلامی کے مرکز میں	۲۲۹	فوج کے سامنے تقریر	۲۶۶
وزیر اوقاف کی جانب سے عشائیہ	۲۳۰	کچھ دیر شہداء موتہ کے مرقد پر	۲۷۳
ملاقاتیں	۲۳۰	موتہ کے تاریخی مقامات	۲۷۶
سلط میں تقریر	۲۴۰	بتراء کا سفر	۲۷۷
استاذ کامل الشریف کے دولت کدہ پر	۲۴۱	عمان سے روانگی	۲۷۹
عمان سے اربد	۲۴۱	اشاریہ (انڈکس)	۲۸۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

www.KitaboSunnat.com

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی

سید المرسلین

کچھ عرصہ ہوا کہ اس سفرنامے کے مصنف کو ایک وفد کی قیادت کی عزت حاصل ہوئی تھی جسے مغربی ایشیا کے کچھ مسلم اور عربی ممالک کا دورہ کرنا تھا یعنی افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور اردن۔ یہ وفد ان وفود کے سلسلہ کی ایک کڑی تھا جنہیں مکہ مکرمہ کے رابطہ عالم اسلامی نے ۱۳۸۳ھ ۱۹۶۳ء میں دنیا کے مختلف اطراف میں بھیجا تھا اور جن کے پروگرام میں دنیا کے پانچوں براعظم شامل تھے، اور جن کا مقصد مسلمانوں کے حالات و کیفیات ان کے علمی و تہذیبی اداروں اور ان کی ضرورتوں سے واقفیت بہم پہنچانا، اور وہاں کے باشندوں کو رابطہ کے مقصد و پیام سے آگاہ کرانا تھا۔

وہ سفر جس کا اس کتاب سے تعلق ہے ۲۴ جون ۱۹۶۳ء سے ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء کے درمیان ہوا تھا۔ مصنف نے اس سفر کی معلومات اور اپنے مشاہدات و تاثرات، ہونے والی

گفتگوؤں اور تقریروں، ملاقاتوں اور زیارتوں کا حال زیادہ تر اپنے حافظے کی مدد سے لکھا ہے، اور کبھی کبھار اس کے لئے ٹیپ ریکارڈ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس طرح یہ سفرنامہ ان ممالک کی زندگی کے مختلف گوشوں، ان کے مسائل و مشکلات، وہاں کی فکری، تہذیبی اور نفسیاتی کشمکش اور ان کی رہنمائی کی ضرورتوں کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن گیا ہے جس کی مدد سے ناظرین اور ان ممالک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو صحیح واقفیت اور ان ممالک کے حالات و حوادث کا صحیح ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔

یہاں خاص طور پر دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ اس کتاب میں جو تاثرات و مشاہدات، تجویزیں اور تنقیدیں درج ہوئی ہیں، وہ اصلاً مصنف کتاب کے دل و دماغ پر اس سفر سے مرتب ہونے والے احساسات و تصورات کا عکس اور ان کا پرتو ہیں، اور ان کا تعلق مصنف کے مخصوص مطالعہ، اس کے تجربات اور آرا و افکار سے ہے، اس لئے ان چیزوں کی ذمہ داری اور مسئولیت بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔ مصنف ان کے بارے میں ہمیشہ "رابطہ" ہی کا ترجمان نہیں رہا ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ "رابطہ" اس کتاب کے تمام مندرجات سے متفق ہو، اور نہ "رابطہ" پر مصنف کے ہر نقطۂ نظر اور تمام افکار و خیالات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

۲۔ مصنف نے اپنے بیان میں تمام نزاکتوں اور باریکیوں، صداقت و انصاف اور غیر جانبداری کا لحاظ رکھا ہے اور حقیقت تک پہونچنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے، تاہم افراط و تفریط، غلطی اور نادانستگی، مختلف تحریکات اور اداروں کے بارے میں اظہار رائے میں نقص و کوتاہی سے خالی ہونے کا دعویٰ نہیں، اس کا امکان اور اندیشہ اس شخص کے لئے خاص طور پر ہے جسے حالات نے ان ممالک میں طویل قیام، شخصی اور ذاتی واقفیت اور تفصیلی جائزے کی اجازت نہیں دی،

اسی لئے بہت سے سیاح اور جہاں نورد اس قسم کی غلطیوں کے شکار رہتے ہیں، اس لئے ناظرین اگر اس قسم کی کوئی غلطی دیکھیں تو معذرت قبول کریں، غلطی اور سہو سے منزہ ذات تو صرف خدا کی ہے۔

حسن اتفاق تھا کہ اس سفر کا آغاز افغانستان کے دار الحکومت کابل سے اور اس کا اختتام اردن کے دار الحکومت عمان پر ہوا، اس مناسبت سے مصنف نے کتاب کا نام "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" رکھا۔ یہ دونوں تاریخی دریا ان دونوں ملکوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اور ان سے ماضی و حال کے بہت سے تاریخی و اسلامی حوادث و حالات وابستہ ہیں، دونوں کے درمیان قرن اول کی اسلامی فتوحات اور صحابہ نے ربط و اتصال پیدا کر دیا تھا۔

مصنف کو اس سے پہلے ایک اور سفرنامہ کی تالیف کا موقع ملا تھا، جو "مذکرات سائح فی الشرق العربی" (مشرق وسطی کے سیاح کی ڈائری) کے نام سے ۱۹۵۴ء میں قاہرہ سے شائع ہوا تھا، اور ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے[1]۔

اسی طرح یہ سفرنامہ اس سلسلہ کی گویا دوسری کڑی ہے، ناظرین ان دونوں سفرناموں سے نئے حوادث اور تبدیلیوں اور ۲۴ سال کی محدود مدت میں ہونے والے تغیرات کو جان پہچان سکتے ہیں، ان میں حسن وسائل مطالعہ اور ذہنی ارتقا کا فرق بھی محسوس ہوگا، جو لازمی اور قدرتی ہے، پھر وہ سفرنامہ ایک شخصی ڈائری اور سفر کا کچا چٹھا تھا، یہ سفرنامہ ان ملکوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتا ہے، جو ان ملکوں کے دینی و تہذیبی مستقبل سے دلچسپی اور عالم اسلام کا درد رکھنے والوں کو غور و فکر کا سامان مہیا کرتا ہے اور کسی درجہ میں بے چین و مضطرب بھی بناتا ہے۔

---

[1] عزیزی مولوی شمس الحق ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے اس سفرنامہ اور روزنامچہ کا ترجمہ اردو میں کیا اور مکتبہ فردوس، مکارم نگر لکھنؤ نے "مشرق وسطی کی ڈائری" کے نام سے شائع کیا ہے۔

گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

یہ کتاب من نہر کابل الی نہر الیرموک کے نام سے دار الجلال (انگورہ: ترکی) کی طرف سے جون ۱۹۶۸ء میں بیروت میں طبع ہوئی، کتاب کے پریس میں آنے سے پہلے ہی مصنف نے اس کے مختلف حصے اپنے مختلف عزیزوں اور رفیقوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے حوالہ کر دیئے تھے، ان عزیزوں اور رفیقوں نے یہ خدمت خوش اسلوبی اور مستعدی سے انجام دی، اور عربی ایڈیشن کے نکلنے سے پہلے انھوں نے اس کے اردو ترجمے کا کام مکمل کر لیا، ان عزیزوں اور رفیقوں کے نام اپنی اپنی جگہ پر دیدیئے گئے ہیں، مصنف نے اس ترجمہ پر نظر ثانی کی، عربی ایڈیشن میں اکثر فارسی اشعار حذف کر دیئے گئے تھے، اور عربوں کے ذوق کی رعایت میں عربی اشعار پر اکتفا کیا گیا تھا، بعض تفصیلات بھی جن کی عرب قارئین کو چنداں ضرورت نہ تھی، قلم انداز کر دی گئی تھیں، اب نظر ثانی میں ان کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب اپنی عربی اصل سے زیادہ مفید اور برصغیر کے اردو خواں طبقے کے لئے زیادہ دلچسپ اور ان کے ذوق کے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے پورے الحاح و اخلاص سے دعا ہے کہ کتاب کو نافع بنائے، اس کے ذریعہ تاریک راہوں کو روشن کرے، اور اس سے اسلامی پیغام اور ان ممالک کی خدمت کرنے والوں اور ان کو گھیرے ہوئے خطرات اور نئے چیلنج سے حفاظت کرنے والوں کے عزم و ہمت کو طاقت پہونچائے۔ "وعلی اللہ قصد السبیل۔"

ابوالحسن علی ندوی
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۲ر۲ر۱۳۹۲ھ
۱۸ر۴ر۱۹۷۲ء

مجاہدین اور فاتحین کی سرزمین
افغانستان میں

ترجمہ

نور عظیم ندوی

ہندوستان اور اسلام کی تاریخ میں افغانستان کا کردار

افغانستان اسلامی تاریخ کے ہر دور میں بہادروں اور شہسواروں کا مرکز، شیروں کا غار، فاتحین اور سورماؤں... کا مولد، ہندوستان اور اسلام کا مضبوط قلعہ رہا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ امیر البیان امیر شکیب ارسلان اس ملک کا تذکرہ لکھنے بیٹھے تو اسلامی جوش سے مغلوب ہو گئے اس مجاہد ملک کی تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئی وہ اشہب قلم کو قابو میں نہ رکھ سکے اور لکھ گئے:۔

> "میری جان کی قسم، اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس کی زندگی کی رمق باقی نہ رہے، پھر بھی کوہ ہمالیہ اور ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا، اور اس کا عزم جوان رہے گا۔"[1]

افغانستان ہندوستان کا پڑوسی ملک ہے اور ایسا پڑوسی کہ پانچویں صدی ہجری[2] کی ابتدا سے

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۱۹۱

[2] پانچویں صدی ہجری کی ابتدا ہی میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی

دونوں کی تاریخ مشترک ہے، دونوں کی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، اور سیاست و حکومت ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی رہی ہے۔ اور ان ہی عوامل کی کارفرمائی اور باہم دگر اثر پذیری و اثر انگیزی سے ایسی تہذیب اور ایسا نظام وجود میں آیا جسے پورے طور پر نہ افغانی کہا جا سکتا ہے، نہ ہندوستانی اور نہ خالص اسلامی۔ آخری دور میں اسے ہند افغانی اسلامی تہذیب (INDO-AFGHAN MUSLIM CULTURE) کا نام دیا گیا۔

پانچویں صدی ہی سے ہندوستان پر یا تو ترک نسل سے تعلق رکھنے والے خاندانوں کی حکومت رہی جو افغانستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے، وہ جن ملکوں سے گزرتے وہاں کے فوجی اور رضاکار نوجوان کے ساتھ ہو لیتے مثلاً غزنوی، خاندان غلامان کے سلاطین، خلجی، تغلق اور آخر میں مغل یا وہ اپنی نسل، تہذیب اور روایات کے اعتبار سے افغانی ہی تھے جیسے غوری، لودھی اور سوری خاندان۔ ہندوستان اسی زمانہ سے ان غیر معمولی جرأت و ہمت اور بے مثال شجاعت و شہامت والے اولوالعزموں اور شاہینوں اور عقابوں کی جولانگاہ رہا ہے، پہاڑوں سے گھرا ہوا ان کا اپنا ملک، ان کے بلند عزائم کے سامنے محدود اور تنگ نظر آتا اور فتح و ظفر کے شوق کی تسکین اور شجاعت و شہامت کے جوہر دکھانے کے لئے انہیں مناسب میدان نہ ملتا تو ہندوستان کا رخ کرتے، ادھر ہندوستان مختلف اوقات میں ذہنی افسردگی، قوائے عمل کی سستی، بدنظمی اور سیاسی انتشار کا شکار رہتا، ان ایسے اوقات میں حرکت و زندگی اور جوش و جذبے سے بھرپور یہ جفاکش اور جنگجو افغانی ہندوستان کا رخ کرتے، قلیل تعداد کے باوجود بڑی بڑی فوجوں کو شکست دیتے، مضبوط و مستحکم حکومتیں قائم کرتے اور ہندوستانی معاشرے کے تن ناتواں میں نیا خون دوڑا دیتے۔

اسی طرح افغانستان میں اندرون ملک یا سرحدوں پر بسنے والے بہت سے

خاندان ضروریات زندگی اور وسائل کی کمی کی وجہ سے تلاش معاش یا طمع آزمائی کے شوق میں ہندوستان آجاتے اس طرح کے قافلے عہد اسلامی کی ابتدا ہی سے ہندوستان آتے رہے وہ اپنے ساتھ اپنی بہترین خاندانی خصوصیات اور موروثی صلاحیتیں لاتے اور یہاں ہندستانی ماحول و معاشرہ سے یہاں کی خصوصیات، انداز و اطوار اسلامی اقدار اور ہندوستانی اخلاق و آداب بھی حاصل کرتے ان کی بہادری، جرأت، غیرت اور ذہانت و فطانت میں مزید جلا پیدا ہو جاتی اور وہ اکثر شجاعت، غیرت، نخوت، ذوق کی لطافت اور احساس کی نزاکت میں اپنے قدیم ہم وطنوں سے بھی فائق ہو جاتے، اس طرح کے بہت سے قبائل ہندستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، اور انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں، انھیں سے مختلف حکومتوں میں انتظامیہ کی مشینری فراہم ہوتی تھی، اور یہی ہر زمانہ میں فوج کی طاقت کا سرچشمہ اور اس کا بنیادی عنصر ہوتے۔

یہاں کے مسلمان طویل مدت تک افغانستان کو ایسا ملک سمجھتے رہے جو ہندستان کے لیے فرمانروا، حکام، منتظمین اور فوجی برآمد کرتا تھا، وہ اس کو "ولایت" کہتے تھے جس طرح انگریزی دور حکومت میں انگلینڈ اور اس کے دار الحکومت لندن کو ولایت کہا جاتا تھا، افغانستان سے آنے والے "ولایتی" کہلاتے تھے، برآمد کا یہ سلسلہ بہادر سپاہیوں، فاتحین فوجی سربراہوں تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اس سے زیادہ وسیع اور عام ہو گیا، چنانچہ ہندوستان میں افغانستان سے ممتاز علما اور اصحاب درس بھی تشریف لائے، اور بعض ایسی تصنیفات تحفہ میں دیں کہ علمائے ہند ایک مدت تک ان کے درس و تدریس اور شرح و تفصیل میں مشغول و منہمک رہے۔[1]

---

[1] جیسے علامہ محمد اسلم ہروی (م ۱۰۶۱ھ) اور ان کے ممتاز فرزند اور منطق کی مشہور کتاب (باقی ص۱۸ پر)

افغانستان ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں

ہندوستانی مسلمان جب سخت اور دشوار ترین مراحل سے گذرتے روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی ہر طرف یاس و ناامیدی کے بادل امنڈتے دکھائی دیتے جبکہ عام طور سے انسان اتفاقات، ملہمات اور خارجی امداد کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے تو وہ افغانستان کی طرف حسرت سے دیکھتے کہ شاید یہی ملک ان کو دشواریوں اور طوفانوں سے نجات دلائے گا۔ اگرچہ حسن ظن اور خوش فہمی حدود سے بڑھ کر حسین خوابوں اور آرزوؤں تک پہنچ جاتی۔ اور وہ خطرناک حد تک خود اعتمادی کے نقصان کا شکار ہو جاتے، ہندوستانی مسلمانوں کی یہ آرزو حیرت انگیز شکل میں اس وقت پوری ہوئی جب کہ دہلی میں مرہٹوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی اس کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے اور مسلمانوں کے رہے سہے اثر و اقتدار اور سیاسی وزن و وقار کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے دہلی کی حکومت ان کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی اور مسلمان ان کے رحم و کرم پر تھے، مسلمانوں کی اضمحلال و انتشار کی شکار اور تھکی ہوئی فوجی طاقت اس ابھرتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی اس وقت مسلمانوں کی نگاہیں افغانستان کی طرف اٹھ گئیں کہ وہی ان کو اس جانکاہ مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے اور بعض مسلمان رہنماؤں نے اپنے عہد میں مشرق کے سب سے بڑے فوجی رہنما احمد شاہ ابدالی کو ان حالات کی طرف توجہ

(باقی صفحہ ۱۷ کا) یہ رسالہ میر زاہد کے مصنف، میر زاہد (م ۱۱۰۱ھ) ان کے اور ہندوستان کے دوسرے افغانی علماء کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو مولانا سید عبدالحئی حسنیؒ کی کتاب نزہۃ الخواطر خاص طور سے اس کی پانچویں اور چھٹی جلدیں۔

کرنے کی دعوت دی[1] جس کا ستارۂ اقبال نیا نیا طلوع ہوا تھا، اور متعدد معرکوں میں اس کی قیادت و شجاعت کے جوہر آشکارا ہو چکے تھے، ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کی تمام مسلم طاقتیں مسلک و خیال کے اختلافات کے باوجود اس جھنڈے تلے جمع ہو گئیں اور (دہلی کے قریب پانی پت میں) مرہٹوں سے فیصلہ کن جنگ ہوئی، اس کے بعد مرہٹے سنبھالا نہیں لے سکے۔

انگریزی تسلط و اقتدار کے زمانہ میں افغانستان پر مسلمانوں کے مبالغہ آمیز اعتماد اور ان سے امداد کی توقع میں مزید اضافہ ہو گیا، ان کی نگاہیں مستقل شمال مغربی سرحد پر لگی رہتی تھیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسا کوئی سالار لشکر اپنی ٹڈی دل فوج کے ساتھ درۂ خیبر پار کرے اور ان کو انگریزی تسلط سے نجات دلائے۔ قدرتی بات تھی کہ ان کی توقع پوری نہیں ہوئی کیونکہ افغانستان خود اپنے اندرونی مسائل میں الجھا ہوا تھا، علاوہ ازیں وہ خود دو گونہ خطرات کی زد میں تھا، اس کی آزادی و استقلال کو ایک طرف برطانیہ سے خطرہ لاحق تھا، دوسری طرف روس سے، پھر ایک چھوٹا سا کمزور ملک ہندوستان پر حملہ کر کے طاقتور اور مستحکم انگریزی حکومت کو کیسے شکست دے سکتا تھا، بہرحال ہندوستانی مسلمان اور آزادی کے متوالے برادران وطن ایک عرصہ تک انھیں خوابوں اور تمناؤں کی دنیا میں بستے رہے۔

امیر حبیب اللہ خاں فرزند امیر عبدالرحمٰن خاں ۱۹۱۹ء میں قتل کیے گئے، ان کے بیٹے امیر امان اللہ خاں تخت نشین ہوئے تو انھوں نے انگریزوں کے مقابلہ میں مضبوط اور

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) ان میں سب سے ممتاز ہیں، انھوں نے افغانی سردار احمد شاہ ابدالی کو کئی خطوط لکھے جن سے ان کی باخبری اور دور بینی کا اندازہ ہوتا ہے، خطوط کے لیے ملاحظہ ہوں شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

جرأت مندانہ موقف اختیار کیا اور جنرل محمد نادر خان کی قیادت میں افغانی فوج کو برطانوی فوجوں کے مقابلہ میں متعدد کامیابیاں حاصل ہوئیں تو امیر امان اللہ خان مسلمانوں اور حریت پسندوں کی محبت و عقیدت کا مرکز اور ان کا محبوب و دل پسند موضوع گفتگو بن گئے ادھر مسلمان انگریز حکومت سے عاجز آ چکے تھے، ملک کی سرزمین اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، چنانچہ افغانستان کی طرف ہجرت کی لہر چل پڑی اور سیکڑوں ممتاز مسلمان اور تعلیم یافتہ انقلابی نوجوان ہجرت کرکے کابل پہنچ گئے، لیکن چونکہ یہ اقدام کسی سوچے سمجھے پروگرام کے تحت نہیں ہوا تھا، اور کسی بھی راہنما نے نہ تو اس سے پیدا ہونے والے مسائل اور متوقع نتائج پر غور کیا تھا، نہ اس سلسلہ میں افغانی حکومت سے کوئی مفاہمت ہوئی تھی، بالآخر تحریک ناکام ہو گئی، اور ہجرت کرنے والوں کو بعض دشواریاں بھی پیش آئیں۔

پھر بعض معاملات میں امیر امان اللہ خان کی بعض جدتیں اسلامی روایات کی مخالفت، مصطفیٰ کمال پاشا کی تقلید میں اہل مغرب کی نقالی اور اپنی ملکہ کو بے پردہ نکالنے کی وجہ سے افغانی قوم میں ان کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی، اور وہاں انتشار برپا ہو گیا انگریز بہت دنوں سے اس کی تاک میں تھے، انھوں نے اس شورش کو امیر امان اللہ خان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے استعمال کیا، اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا، ۱۹۲۹ء میں امیر امان اللہ خان تخت سے ہٹائے گئے اور وہاں حبیب اللہ عرف بچہ سقہ برسر اقتدار آ گیا، ان حالات سے اہل ہند بہت متاثر اور فکر مند ہوئے، جیسے یہ ان کے اپنے ہی ملک کے مسائل ہوں، یہاں تک کہ جنرل نادر خان سامنے آئے، زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور حالات درست کئے تو افغانستان سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی سکون قلب میسر آیا۔

اور یہ تو ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ جنرل محمد نادر خاں نے علامہ اقبال سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کو ۱۹۳۳ء میں اپنے ملک کے بعض اسلامی تعلیمی مسائل میں مشورے کے لئے دورۂ کابل کی دعوت دی۔ ان حضرات نے بخوشی دعوت قبول کی اور اسے ایک قدیم اسلامی مملکت کی زیارت اور ایک مسلمان مجاہد سربراہ سلطنت سے ملاقات کے لئے قیمتی موقع شمار کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم وہاں سے واپس تشریف لائے تو بہت ذوق و شوق سے وہاں کے حالات و تاثرات بیان کر رہے تھے، وہ شاہ کی ملاقات سے بہت گہرا اثر لے کر لوٹے تھے، اور لکھنؤ ہی میں مقیم تھے کہ اچانک شاہ کی شہادت کی خبر ملی جس سے وہ بہت مغموم و متاثر ہوئے۔

انگریزی دور حکومت میں ہندستان اور افغانستان کی سرحدیں کھلی ہوئی تھیں، وہاں سے تاجر، علماء اور طلبہ آتے تھے، اہل ہند ان کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کو اپنے سے زیادہ طاقتور اور غیور سمجھتے تھے، ہمارے بچپن میں کابل کے تاجر اپنے علاقہ کی مختلف اشیاء لئے اکثر دیہاتوں اور شہروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے، وہ شلواروں کے بڑے پابند ہوتے تھے، ان کی جسمانی قوت، ان کی ہیئت کذائی اور ان کا ڈھیلا ڈھالا لباس لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا، بچے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ انھیں "آغا" کہتے تھے، بچپن میں ہم نے صرف اسی طرح کے ملک میں گھومنے پھرنے والے تاجر قسم کے افغانی دیکھے تھے لیکن جوں جوں عمر اور اس کے ساتھ معلومات میں اضافہ ہوا تو اپنے پڑوسیوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا خاصی معلومات حاصل کیں اور اس ملک کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

سفر افغانستان میں تاخیر

میری زندگی میں بیرونی سفر اور غیر ممالک کے دورے کوئی نئی بات نہیں، میں نے کئی مرتبہ مختلف عرب ممالک کا دورہ کیا ہے، متعدد بار یورپ بھی گیا ہوں، عالم اسلام کے فردوس گم گشتہ اندلس (اسپین) کی بھی زیارت کی ہے، مغربی ایشیا کے اکثر اور بحر ہند کے بعض ممالک میں بھی جانا ہوا ہے، قرائن اس کے موجود تھے کہ اس پڑوسی ملک کے دورہ کا بھی موقع ملتا، ہندوستان کی آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے، کابل اور غزنین میں ہمارے بعض احباب بھی تھے، جن سے قدیم دینی و علمی روابط تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) کی دعوت اصلاح و تجدید اور تحریک جہاد میں بھی افغانستان کا بڑا اہم کردار رہا ہے، وہ اپنی سرگرمیوں اور جد و جہد کے مرکز تک افغانستان ہی کی راہ سے پہنچے تھے، اہل افغانستان نے بے نظیر جوش و خروش کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا، پوری قوم اور حکومت ان کی طرف جھک پڑی تھی اور حکمراں خاندان سے بھی ان کے تعلقات رہے تھے، کبھی مستحکم اور کبھی کمزور، جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے[1]۔ اگر اس فیصلہ کن اور تاریخی موقعہ پر افغانستان کے امراء نے وقت کی اہمیت کا اندازہ لگایا ہوتا، اس تحریک کی قدر کی ہوتی اور اس کے قائد کے اخلاص، اس کی دردمندی اور اثر انگیزی کو صحیح طور پر محسوس کیا ہوتا تو اس علاقہ میں مسلمانوں کی تاریخ آج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تابناک اور باعظمت ہوتی۔

---

[1] افغانستان میں وہی خاندان اب تک برسر اقتدار ہے، سید احمد شہیدؒ کی دعوت و تحریک کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ"۔

میں نے نوجوانی ہی کے دور میں سید احمد شہیدؒ اور ان کی دعوت پر ایک کتاب لکھی تھی[1] اور شمالی سرحد کے ان علاقوں کو بار بار دیکھ چکا تھا جہاں جہاد کے معرکے گرم ہوئے تھے اور ان کا اسلامی نظام قائم ہوا تھا، مگر اس دعوت کی تاریخ سے گہری دلچسپی، اس موضوع پر مطالعہ و تحقیق، بہادر اور غیور افغانی قوم اور اس کی اپنے ملک سے محبت و تعلق کی قدر کے باوجود مجھے اس ملک کی زیارت کا موقعہ نصیب نہیں ہوا۔

رابطۂ عالم اسلامی کا وفد

اللہ تعالےٰ رابطۂ عالم اسلامی کا بھلا کرے کہ اس نے شجاعت و سرفروشی کی اس سرزمین کی زیارت کا موقع فراہم کر دیا، ساری سہولتیں مہیا کیں اور اس کے ذمہ داروں نے اتنا اصرار کیا کہ میری معذوریاں، مشاغل کی کثرت اور دوسری رکاوٹیں سد راہ نہ بن سکیں اور میری ایک دیرینہ تمنا کے بر آنے کی صورت پیدا ہو گئی، رابطہ نے ——— افغانستان ایران اور مغربی ایشیا کے بعض عرب ممالک کے دورہ کے لئے ایک وفد کی تشکیل کی، مجلس تاسیسی (FOUNDATION BODY) کے دو ممبران اس کے رکن منتخب ہوئے اور رابطہ کی سکریٹریٹ میں اسلامی تنظیموں کے شعبے کے ذمہ دار ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو وفد کے سکریٹری اور میرے خاص رفیق و معاون کی حیثیت سے وفد میں شامل کیا گیا اور اس وفد کی قیادت و سربراہی کی ذمہ داری میرے ناتواں کاندھوں پر ڈالی گئی، لیکن دونوں

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا، مصنف نے اس میں اضافہ کا سلسلہ جاری رکھا، حال میں اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن پانچ پانچ سو صفحات کی دو ضخیم جلدوں میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔

معزز ممبران — بیروت کے شیخ سعدی یاسین اور سری لنکا کے مسٹر حنیفا محمد حنیفہ سابق وزیر لنکا بعض اسباب و عوائق کی بنا پر ہندوستان نہیں آسکے، تو رابطہ کے سکریٹریٹ کی نظر انتخاب سعودی عرب کے مشہور و ممتاز صاحب قلم مجلس شوریٰ کے رکن جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے پروفیسر شیخ احمد محمد جمال پر پڑی، یہ انتخاب بڑا موزوں و مناسب تھا، اتوار ۳ / جون ۱۹۷۳ء کی صبح کو وہ مکہ سے براہ راست کابل پہنچ گئے اور میں بعض اسباب کی بنا پر ایک دن کی تاخیر سے ۴ / جون ۱۹۷۳ء کی شام کو کابل پہنچا۔

محترم شیخ صالح قزاز سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی کی سربراہی میں امانت عامہ (جنرل سکریٹریٹ) پہلے ہی سے وفد کے پروگرام اور دیگر سہولیات کے سلسلہ میں افغانستان کے ذمہ داروں اور کابل میں سعودی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کر چکی تھی تاکہ وفد بہتر طریقے سے اپنے فرائض انجام دے سکے اور اپنا پیغام پہنچا سکے۔

حکومت افغانستان نے دنیا کے عظیم ترین اور اہم ترین اسلامی ادارہ کی نمائندگی کرنے والے اس وفد کو خوش آمدید کہا جس میں سارے عالم اسلام کے علماء، فضلاء، مفکرین اور اصحاب رائے کی بڑی تعداد کی نمائندگی ہے اور جو ایسے شہر میں قائم ہے جس کی مسلمانوں کے دلوں میں بڑی عزت و عظمت ہے، اور خادم الحرمین الشریفین اور اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی شاہ فیصل جس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

افغانوں کی مہمان نوازی اور اکرام ضیف مشہور ہے، چنانچہ قدیم روایات کے مطابق افغانی حکومت نے اصرار کیا کہ وفد سرکاری مہمان ہے اور وزارت تعلیم کے سپرد کیا کہ وفد کے لئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرے، سفروں اور ملاقاتوں کا پروگرام مرتب کرے، لہٰذا سعودی سفارت خانہ نے شکریہ کے ساتھ یہ کریمانہ پیشکش قبول کر لی۔

سرزمین کابل میں

ہم دوشنبہ ۴ جون ۱۹۷۳ء کو دہلی سے ایک افغانی طیارہ کے ذریعہ روانہ ہوئے، اناؤنسر نے اعلان کیا کہ کابل قریب آگیا ہے تو کانوں میں نغمگی اور دل میں شگفتگی محسوس ہوئی کہ آج ایک دیرینہ تمنا پوری ہو رہی تھی، مقامی وقت کے مطابق ۵ بجے شام ہمارا طیارہ کابل ہوائی اڈہ پر اترا، موسم مناسب تھا۔

دہلی کے سخت موسم کے مقابلہ میں اعتدال سے زیادہ قریب، ہمارے استقبال کے لئے افغانستان میں سعودی سفیر ہمارے پرانے کرم فرما، ہندوستان میں سابق سعودی سفیر اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبوب شخصیت شیخ محمد احمد شنیطی ہوائی اڈہ پر موجود تھے، ان کے ساتھ سعودی سفارت خانہ کے نائب سفیر علی الفوزان، ہمارے وفد کے ممبر شیخ احمد محمد جمال، کابل یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ کے پرنسپل غلام محمد نیازی، افغانی وزارت تعلیم میں دینی تعلیم کے ڈائرکٹر شیخ محمد اسلام تسلیم، دار الحفاظ کابل کے مدیر سید محمد یعقوب ہاشمی، کلیۃ الشریعۃ کے استاذ پروفیسر عبد الرسول سیاف اور دوسرے متعدد علماء و اعیان بھی موجود تھے، پروفیسر سیاف ہی کو وزارت تعلیم نے ہمارے وفد کا رفیق اور مترجم منتخب کیا تھا۔

ہوٹل کابل میں ہمارے قیام کا انتظام تھا، اور حسن اتفاق کہ چالیس سال پہلے علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور سر راس مسعود پر مشتمل وفد کابل کے دورہ پر آیا تھا تو اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوا تھا، اس عرصہ میں اس کی عمارت نئی تعمیر کی گئی اور بعض اصلاحات بھی کر دی گئی ہیں، میں جس کمرہ میں مقیم تھا اس کی کھڑکی امیر عبد الرحمن خان غازی کے مقبرہ کی طرف کھلتی تھی، انگریزوں سے جنگ اور اسلام سے بیگانہ دور دراز علاقوں میں اشاعت اسلام کے

سلسلے میں ان کے عظیم الشان کارنامے مشہور ہیں[1]، اس سے عظمت رفتہ اور اچھے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

وزارت تعلیم کی ضیافت اور رہنمائی میں

ہم لوگ کابل میں کل چھ دن گذارنے تھے، اور مقامی وزارت تعلیم نے سعودی سفارتخانہ کے تعاون سے مختلف مقامات کے دوروں، ملاقاتوں، جلسوں اور تقریروں کا تفصیلی پروگرام مرتب کر لیا تھا، اور اس پروگرام کی ترتیب و تشکیل بلکہ وفد سے غیر معمولی دلچسپی اور اس کے اعزاز و اکرام زیادہ تر کلیۃ الشریعۃ (کلیہ فاکولتہ شرعیات۔ پوہنتون کابل) کے پرنسپل ڈاکٹر غلام محمد نیازی کا رہین منت ہے، انھوں نے پہلا مناسب کام تو یہ کیا کہ کلیۃ الشریعۃ کے استاذ پروفیسر عبدالرسول سیاف کو وفد کا رفیق اور مترجم مقرر کیا، وہ افکار و خیالات ترجمہ پر قدرت اور جوش و جذبہ ہر اعتبار سے اس نازک اور دشوار کام کے لئے موزوں ترین شخص تھے، میں نے ان کے جیسا ترجمہ پر قادر اور اس کا پورا پورا حق ادا کرنے والا اور متکلم کی صحیح ترجمانی کرنے والا کم دیکھا ہے، وہاں کے نوجوانوں سے ان کے تعلقات بھی وسیع اور گہرے ہیں،

---

[1] امیر شکیب ارسلان حاضر العالم الاسلامی پر اپنے مشہور اور بیش قیمت حواشی میں امیر عبدالرحمن کی سیاسی و انتظامی خصوصیات و امتیازات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: مشرقی جانب حدود سلطنت کو وسیع کیا، وادی کفرستان کو اپنے زیر نگیں کر لیا، وہاں کے باشندوں کو انہی کے ذریعہ اللہ نے اسلام کی ہدایت دی اور اس کا نام نورستان رکھا، مختصر یہ کہ انہی کے زمانہ میں افغانی قوم سکون و آرام سے لذت آشنا ہوئی اور اتحاد کا مفہوم سمجھا، وہ ملک کی اصلاح میں مشغول رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے، یہ سانحہ ۱۳۱۹ھ میں پیش آیا، بحیثیت مجموعی وہ حکومت، حسن انتظام اور عزم کی پختگی میں اپنے زمانہ کے بہترین بادشاہوں میں شمار کئے جانے کے مستحق تھے۔ (حاضر العالم الاسلامی ج ۲ صفحہ ۱۹۱)

اور صحیح اور صالح بنیادوں پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی عقلی و فکری تربیت اور موزوں ذہنی رہنمائی کی بڑی فکر رکھتے ہیں، جامع ازہر کے کلیہ اصول الدین کے فارغ التحصیل ہیں، ملاقات سے پہلے میری بعض کتابیں پڑھ چکے تھے، موصوف اور ان کے رفقاء سید قطب شہید، مولانا مودودی اور راقم الحروف کی کتابوں سے بہت متاثر ہیں، اور مقامی دونوں زبانوں ـــــ فارسی اور پشتو ـــــ میں ان کے تراجم کے خواہشمند بھی اس رجحان میں وہ اور معزز فضلاء ـ ڈاکٹر محمد موسیٰ توانا اور برہان الدین ربانی ـــ ان کے شریک و سہیم ہیں، مؤخر الذکر کی متعدد تصنیفات اور تراجم زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکے ہیں۔

ہم نے کابل میں جو چند دن گزارے وہ تعداد میں اور ملک کی وسعت و اہمیت کے اعتبار سے تو بہت کم تھے لیکن پروگراموں اور مشاغل کی کثرت کے اعتبار سے بہت مشغول بہت مفید اور قیمتی تھے، اور قیام کے اس اختصار ـ ـ جس پر ہم بعض اسباب کی وجہ سے مجبور تھے ـــ کی ہمیں قیمت بھی چکانی پڑی، متواتر کام اٹھتے ہوئے پروگرام، اور تھکا دینے والی مسلسل مشغولیت برداشت کرنی پڑی، اکثر ایک ہی دن میں چار چار، پانچ پانچ پروگرام اکٹھا ہو جاتے، جن میں بعض بڑے اداروں کو دیکھنا، طلبہ و اساتذہ سے خطاب، اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں اور دعوتوں میں شرکت وغیرہ شامل ہوتے، ادھر ادھر آنے جانے، لوگوں سے ملاقاتوں اور بات چیت میں پورا دن گزر جاتا اور تھکے ہارے رات گئے واپس آتے، لیکن افغانی علماء و عمائدین کے خیر مقدم، نوجوانوں کے جوش اور ان کی توجہ و دلچسپی کی شکل میں ہماری محنت و مشقت اور چین و سکون سے محرومی کا بہترین صلہ مل جاتا۔

تعلیمی و ثقافتی اداروں کا معائنہ

تعلیمی اداروں میں ہم سب سے پہلے کابل کے ایک نواحی محلہ کمرانی میں واقع

"مدرسہ ابی حنیفہ" دیکھنے گئے اور وہاں کے اساتذہ و طلبہ سے گفتگو ہوئی، مدرسہ ابتدائی وسطانی اور ثانوی تین مراحل پر مشتمل ہے، مدرسہ کے ناظم استاذ محمد سیلانی ہیں اس کے درجوں اور ہوسٹلوں اور مطبخ دکھلانے لے گئے، ہم نے متعدد طلبہ اور اساتذہ سے گفتگو بھی کی اور مسجد میں عمومی خطاب کیا، طلبہ کے عربی سے واقف ہونے کی وجہ سے فارسی میں ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اس کے بعد ہم "مدرسہ دار الحفاظ" میں گئے، اس کے ناظم سید محمد یعقوب ہاشمی نے ہمارا استقبال کیا، ہمارے اعزاز میں ایک جلسہ بھی منعقد کیا جس میں مدرسہ کے اساتذہ اور کابل کے علماء و مشیوخ کی اہم تعداد نے شرکت کی، اس کے بعد "دار العلوم" دیکھنے گئے، یہ دارالسلطنت میں سب سے بڑا دینی ادارہ ہے، میں نے سنا کہ موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر محمد موسیٰ شفیق بھی اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ ہیں، اس کا اسٹاف فاضل علماء اور بڑے بڑے مشیوخ پر مشتمل ہے، اس کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مولوی محمد گل ہیں، اس کی صحن میں ایک بڑا جلسہ ہوا، شہر کے علماء، معززین اور اعیان شہر بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور وفد کا پرجوش استقبال کیا گیا، میں نے اور استاذ احمد محمد جمال نے تقریریں کیں، میری تقریر خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کارنامہ، ان کی غیرت ایمانی، مرتدین اور مانعین سے دین کی حفاظت و حمایت اور ان کے یادگار مقولہ "أینقص الدین وأنا حی" (دین میں ترمیم و تنسیخ ہو اور میں زندہ رہ کر اس کو دیکھتا رہوں؟) کی تشریح و تفصیل اور اپنے اپنے ممالک اور زمانوں میں علماء کی ذمہ داریوں سے متعلق تھی، اس سلسلہ میں میں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کارنامہ کو جو ہندوستان کو اسلامی حصار میں رکھنے کے لئے انجام دیا گیا، تفصیل سے بیان کیا، اس لئے کہ افغانستان کے موجودہ حالات و دور کو مجدد صاحب کے دور سے خاص مناسبت ہے، اور ان کی شخصیت یہاں ہر حلقہ میں معروف و محترم ہے چونکہ

فضا علمی و دینی تھی۔ اکثر حاضرین عربی زبان سمجھتے تھے اور ترجمہ کی رکاوٹیں اور الجھنیں نہیں تھیں۔ اس لئے بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ اپنی بات پیش کی۔

ہمیں آج عربی اداروں میں جانے اور وہاں کے علماء اور نوجوانوں سے گفتگو کا موقع ملا۔ اس میں سب سے اہم اور ممتاز "کلیۃ الشریعۃ" تھا۔ ارکانِ وفد کے لئے یہ نظر و دلچسپی کی جگہ تھی، اس لئے کہ یہاں وہ نوجوان زیرِ تعلیم ہیں جن سے اس ملک میں دینی قیادت کی زیادہ سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے۔ یہاں کے اساتذہ بھی اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں اور علم و مطالعہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ یہی کالج وفد کا اصل میزبان تھا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر غلام محمد نیازی کا شمار تحقیقی ذوق رکھنے والے علماء میں ہوتا ہے۔ اسلامیات پر ان کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے۔ کالج نے احباب و رفقاء کے تعارف کے لئے ایک عشائیہ کا بھی اہتمام کیا۔ یونیورسٹی ہال میں منعقد ہونے والے عظیم الشان جلسہ کا انتظام و اہتمام بھی اسی کالج کی طرف سے ہوا تھا جس میں بعض ممالک کے سفراء، ممتاز علماء، اونچی تعلیم یافتہ حضرات، سرکاری ملازمین، تعلیم یافتہ نوجوان اور کالج کے طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ — اس جلسہ کی تقریر عنقریب نظر سے گذرے گی۔

ہم نے ملالی گرلس کالج بھی دیکھا جو تحریکِ آزادی کی قائد ایک افغانی خاتون — ملالی —— کی طرف منسوب ہے۔ استاذ احمد محمد جمال نے یہاں ایک موزوں اور مناسب تقریر کی جس میں انھوں نے شریعتِ اسلامیہ میں مسلمان عورت کی حیثیت اور مسلم معاشرہ میں اس کے حقوق، اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پر روشنی ڈالی۔ اس کالج میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم یورپ کے کسی گرلس کالج یا مغربی ممالک کے کسی زنانہ ثقافتی مرکز میں پہنچ گئے ہیں۔ بے پردگی عام تھی، لیکن ساتھ ہی شرم و حیا اور حجابِ نظر کے آثار بھی نظر آتے تھے جس میں

افغانی خواتین کسی زمانہ میں ضرب المثل تھیں، اس جلسہ میں دلچسپی اور ذہانت کے ساتھ مقرر سے متعدد سوالات بھی کیے گئے، استاذ احمد محمد جمالی نے قابلیت اور سلیقہ کے ساتھ ان کے جوابات دیئے، وہ مسلمان عورت کے حقوق اور اس مسئلہ میں اسلامی قانون اور دوسرے قوانین کے تقابل کے خصوصی ماہرین میں سے ہیں، کالج کی خاتون پرنسپل نے مطالبہ کیا کہ تعدد ازدواج کی حرمت کا متفقہ فتویٰ صادر کر دیا جائے، کیونکہ اس میں عورت کی سخت توہین ہوتی ہے، مقرر موصوف نے اس کے جواب میں وہ اسباب و مصالح بتلائے جن کی وجہ سے اسلام نے یہ حق باقی رکھا ہے۔

ہم لڑکوں کا جدید طرز کا ایک کالج "مدرسہ استقلال" بھی دیکھنے گئے، اس پر فرانسیسی رنگ غالب ہے، اس کے پرنسپل استاذ عبدالہادی فرانس کے تعلیم یافتہ ہیں، یہاں مجھ کو نوجوانوں سے کچھ کہنے کا موقع ملا، میری باتیں کسی کامل کو قابلِ تقلید نمونہ، یا اسوہ (IDEAL) بنانے اور نوجوانوں کی تربیت اور ان کی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر میں اس کے اثرات کے موضوع پر تھیں۔

تجدد پسند افغانی خواتین سے گفتگو

سعودی سفارت خانہ کی شدید خواہش تھی کہ کابل میں ہمارے مختصر ترین قیام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے، وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر علمی و دینی مجلسوں اور ہر طبقہ کے تعلیم یافتہ اور ممتاز افراد سے تعارف اور ملاقاتوں کا انتظام کر رہا تھا، چنانچہ سفیر کی وسیع اور شاندار قیام گاہ پر دو مخصوص نشستیں ہوئیں، ایک نشست ممتاز، معزز اور دیندار گھرانوں سے تعلق رکھنے والی مسلم خواتین کی تھی، مجلس میں شریک ہونے والی خواتین اشراف کا گروپ

اسلامی عقائد سے باغی یا جدید تہذیب و تمدن کے زعم میں دین سے یکسر بیگانہ و بیزار نہیں تھیں۔

افغانی خواتین میں جدید تہذیب اور مستشرقین کے افکار کے اثرات

پھر بھی ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ ملک میں مغربی تہذیب بہت آگے جا چکی ہے اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہونے ہیں یعنی سنہ ۱۹۲۲ء اور سنہ ۱۹۶۲ء کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔

امیر امان اللہ خاں کے دور تک افغانی قوم اسلامی افغانی روایات پر بڑی مضبوطی سے قائم تھی، اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے تھی، اس کا تعصب غلو اور مبالغہ کی حد تک پہنچا ہوا تھا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ امیر امان اللہ خاں کی بعض قدیم اسلامی روایات کی خلاف ورزی کی بنا پر ان کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا، اور ان کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا، لیکن اس وقت صورت حال بالکل مختلف ہے۔ افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جا پڑی ہے اور یہ دوری ماہ و سال کی تعداد کے اعتبار سے تو بہت کم ہے یعنی صرف پینتیس سال لیکن فکری اور تمدنی اعتبار سے یہ مسافت بہت طویل ہے، اکثر قومیں کئی صدیوں میں اتنی مسافت طے کرتی ہیں، پردہ اب پسماندگی، جہالت اور غربت کی علامت بن گیا ہے، اسی وجہ سے دیہاتوں، گاؤں میں بعض دیندار علماء اور دارالسلطنت سے دور کسانوں کے گھروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، فرنگی لباس عام ہے، ابھی بھی قدیم ماحول اور طبیعتوں میں رچی ہوئی اسلامی خصوصیات کے اثرات اب تک ان تعلیم یافتہ مسلم خواتین میں کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہیں، اس لئے ان کے سوالات اور گفتگو میں توہین و استہزا کا انداز نہیں تھا، بلکہ ہم لوگوں سے دوران گفتگو

وہ خاصی محتاط رہیں، ان کی باتوں سے دین اور اہل دین کا احترام جھلکتا تھا، وہ اسلام میں عورت کی حیثیت اور اس کے عطا کردہ مراتب وحقوق معلوم کرنے کا شوق ظاہر کرتی رہیں، لیکن ان کے سوالات سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ غیروں کی تہذیب وتمدن کے اثرات کہاں تک پہنچ چکے ہیں، اور مستشرقین کی تحریریں اور اسلام، اس کے اصول ومبادی اور اسلامی نظام حیات کے خلاف ان کا منظم اور منصوبہ بند پروپیگنڈا اور یورپ کے پھیلائے ہوئے کا [illegible] مساوات مرد وزن کے نظریہ کے اثرات کتنی گہرائی تک اتر چکے ہیں، اس کے مقابلہ میں اسلام اور اسلامی شریعت کو جدید اور مؤثر انداز میں پیش کرنے اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو مطمئن کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اصحاب دعوت وارشاد، اہل قلم اور علمائے کرام کی کوتاہیوں کا بھی ہم کو احساس ہو رہا تھا، بہرحال دونوں طبقوں ـــــ دین کے نمائندہ، علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ ـــــ کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے جس کو پر کرنا آسان نہیں ہے۔

اس مجلس میں ہمارے فاضل رفیق استاذ احمد محمد جمال نے گفتگو کی اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، وہ اس موضوع کے ممتاز ماہرین میں سے ہیں، اور اس سلسلہ میں خاصا کام بھی کر چکے ہیں، انکی کتاب "مَکَانَکِ تُحْمَدِی" اس موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے، میں نے بھی مناسب سمجھا کہ ذہن کو تیار وہموار کرنے کے لئے عمومی انداز کی ایک بات سامنے رکھ دوں، چنانچہ میں نے کہا۔

بے پردگی اور معاشرتی قدروں سے بغاوت قومی زوال کا پیش خیمہ

"میں نے قوموں اور تہذیب وتمدن کی تاریخ ـــــ (اور خاص طور سے قوموں اور تہذیبوں کے ارتقاء وانحطاط کی تاریخ) کا مطالعہ بڑی توجہ اور انہماک سے کیا ہے، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قوموں اور ملتوں کے زوال، ان کی تباہی وبربادی

اور انسانی ترقی یافتہ اور بہت سی قوموں اور تہذیبوں کے زوال و فنا کا سب سے اہم اور بنیادی سبب ہے ان کے عائلی نظام کا انتشار، گھریلو زندگی میں اعتدال و توازن کا فقدان، مرد و زن کے ارتباط باہمی میں فساد و اختلال، گھریلو زندگی سے عورتوں کی بے توجہی اور اس کی ذمہ داریوں سے فرار ــــــ تاریخ میں جتنی بھی زوال پذیر تہذیبیں اور پستی و انحطاط اور تباہی و بربادی کی طرف تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی قومیں نظر آتی ہیں وہاں یہ بیماری ضرور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ عورتوں نے گھریلو زندگی سے فرار اور اس کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی شروع کردی اور ماں کے جذبے سے محروم ہو گئیں، اولاد کی پرورش و پرداخت اور نئی نسل کی تربیت اور اس کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں اور اپنے گھر کو سکون و اطمینان کا گھر بنانے سے غافل ہو گئیں جہاں مرد کو امن و عافیت اور سکون و راحت کی دولت میسر آسکے وہ گھر میں داخل ہو تو محسوس کرے جیسے جنت میں آگیا ہو بلکہ اس کے بجائے وہ مردوں کی ذمہ داریوں اور ان کی کارگزاری کے میدانوں میں برابر کی شرکت، ان کی ہم سفری اور ہم عصری اور ہر میدان میں ان کے دوش بدوش کھڑے ہونے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے شوق میں پاگل ہو گئیں اور اس کے نتیجے میں ان میں عام شہوانیت، ذہنی و فکری انتشار، عام اباحیت، انارکی اور اخلاقی بحران پیدا ہو گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت کے غار کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم اور تیز ہو گئے، یہی قدیم یونانیوں کی کہانی ہے اور یہی قدیم رومیوں اور ایرانیوں کے زوال کی داستان ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں مشرقی قومیں بھی اسی دردناک انجام سے دوچار نہ ہوں اور

رنج و فکر کی بات ہے کہ ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ میں اس کے آثار ظاہر بھی ہو چکے ہیں :

جزوی ترمیم و اصلاح کے ساتھ یہ میری وہاں کی تقریر کا خلاصہ ہے (اور تحریر و تقریر میں بہرحال کچھ فرق ہوتا ہی ہے) امید ہے کہ ہماری یہ سطریں عزیز افغانی بہنوں تک پہنچیں گی کاش کہ یہ ان پیش آنے والے خطرات کا احساس دلانے میں کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔

اس کے بعد استاذ احمد محمد جمال نے ایک عالمانہ تقریر کی اور عورت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر، معاشرہ میں اس کے حدود، اور زندگی میں اس کے فرائض اور پھر خاندان اور صالح معاشرہ کی تشکیل میں عورت کے اہم کردار کی تشریح کی، پھر سوالات کا ایک سیلاب امنڈ پڑا، اکثر سوالات تعدد ازدواج، حق طلاق کے لئے مردوں کی خصوصیت اور شرعی پردہ سے متعلق تھے، مجلس سکوت و وقار کی فضا میں ختم ہوئی اور تمام خواتین و حضرات شام کے کھانے اور عشاء کی نماز کے لئے اٹھ گئے۔

ہمارے رفیق استاذ احمد محمد جمال کابل میں خواتین کی ایک اور نشست میں شریک ہوئے، میں اس وقت غزنی میں تھا اس لئے شریک نہیں ہو سکا، واپسی پر بتلایا گیا کہ پردہ، مردوں کے حق طلاق اور تعدد ازدواج کے موضوع پر گرما گرم بحث ہوئی، ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ افغانی خواتین ذہنی اور فکری انتشار و اضطراب کی کس منزل سے گذر رہی ہیں اور غیر ملکی تہذیب و ثقافت کا پروپیگنڈہ اور اس کے اثرات کس حد تک پہنچ چکے ہیں۔؟

علمائے کابل سے گفتگو

دوسری مجلس علماء کے لئے مخصوص تھی، اور چونکہ حکومت سفارت خانہ کو دینی و مذہبی حلقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس لئے علماء و مشائخ کی بڑی تعداد نے سفارت خانہ کی دعوت قبول کی اور ہر طرح کے تکلف و تصنع سے پاک خالص برادرانہ اور دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوئی۔ اس رات میری گفتگو کا موضوع تھا "اسلام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں علماء کی ذمہ داریاں اور قوم سے براہ راست تعلق" میں نے خاص طور سے دو طبقوں ـــــ عوام اور نوجوانوں کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور اس میدان میں بعض جماعتوں اور تحریکوں کے تجربات بیان کئے، برصغیر کی تبلیغی جماعت اور اس کے طریق کار کا تذکرہ کیا کہ کس طرح اس جماعت نے ہمارے اس دور میں قوم سے براہ راست تعلق قائم کرنے اور عام مسلمانوں کے گھروں، منڈیوں اور بازاروں تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی اور اس کی دعوت دور دراز ممالک تک پہنچ گئی، اسی طرح اس نے عوام میں مذہبی شعور اور دینی جذبہ پیدا کرنے اور آخرت کی طرف توجہ، اخلاق و اعمال کی اصلاح، ایثار، آخرت کی راہ میں محنت و مشقت پر آمادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں نے کہا کہ عوام کو دینی رہنمائی، اسلامی تعلیم و تربیت اور دین کے مکمل شعور کے بغیر چھوڑ دینا بڑا خطرناک ہوتا ہے، ایسی صورت میں وہ کسی بھی مقصد و تحریک کے لئے تر نوالہ اور خوش گوار گھونٹ ثابت ہو سکتے ہیں، اور بڑی آسانی کے ساتھ تباہ کن تحریکوں اور اسلام دشمن افکار و خیالات کا شکار ہو سکتے ہیں۔

پھر میں نے نوجوانوں اور خاص طور سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نوجوانوں

کی طرف توجہ کرنے پر زور دیا کیونکہ وہی موجودہ نسل کی جگہ لینے والی نسل ہے اور وہی ملک کی قیادت، زندگی کی تشکیل، قانون سازی اور تعلیم و تربیت کا رخ متعین کرنے کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے، تمام امور و معاملات کی کلید اور حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھوں میں ہوگی، ان کی اصلاح ملک و قوم کی اصلاح ہے، اور فضائل اسلام پر ان کا پختہ یقین، اسلامی اصولوں اور تعلیمات پر ان کا راسخ ایمان اور دین کے لئے ان کا جوش و جذبہ ہی اس علاقہ میں اسلام کی بقا اور اس کی قوت و شوکت کی ضمانت ہے، اور اسلام کی صلاحیتوں سے ان کی بے اعتمادی، عقیدہ و ایمان کی کمزوری، اسلام کے مستقبل اور اس کی قائدانہ صلاحیت سے مایوسی، مغربی تہذیب ہی کو انسان کی ترقی، آزادی اور عزت و سعادت کی انتہا اور ناقابل تردید حقیقت سمجھنا جس سے انکار و اعراض کی گنجائش نہیں، یہ در حقیقت اسلام کے زوال، زندگی کی رزمگاہ سے اس کے انخلا کا پیش خیمہ اور فکری اور تہذیبی ارتداد ہے، جب یہ طرز فکر کسی ملک پر حملہ آور ہوتا ہے اور اس کی تیز و تند موج چلتی ہے تو نہ عالی شان محلوں کو چھوڑتی ہے، نہ پامال جھونپڑیوں کو، نہ کسانوں کے کھیتوں کو، نہ کسی عالم کے مدرسہ کو، نہ کسی گوشہ نشین عابد و زاہد کی خانقاہ کو میں نے بعض اسلامی ممالک کے دردناک انجام کی مثالیں بھی بیان کیں جہاں علماء نے نوجوانوں پر توجہ دینے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں پہلوتہی کی، ان کو متاثر کرنے میں ناکام رہے اور ان کو بے سہارا چھوڑ دیا کہ الحاد، فساد، کمیونزم، وجودیت اور اباحیت کے داعیوں میں سے جو چاہے ان کو اپنا شکار بنالے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان نوجوانوں کے ذہن و دماغ پر ملحد، زندیق، جارحانہ قوم پرستی کے داعی یا دین کے دشمن کمیونسٹ چھا گئے، انھوں نے اپنی سرگرمیوں کے لئے دو میدان منتخب کئے، تعلیم گاہیں اور

لیں، اور چند ہی سالوں میں اتنی طاقت حاصل کر لیں کہ پورے ملک کو اپنے ڈنڈے سے جدھر چاہیں ہانکتے رہیں، حکومت و اقتدار کی کلید اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور طاقت و قوت کے ہر اس سرچشمہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لیں جس سے ملک کی سیاست و حکومت کے طریق کار اور اس کی رفتار پر اثر انداز ہونا ممکن ہے۔[1]

میں نے اس کی بھی وضاحت کی کہ نوجوانوں میں کام کرنے کے لئے، جدید اسلوب، جدید زبان، نوجوانوں کی نفسیات کے گہرے مطالعہ اور ان کو درپیش مسائل و مشکلات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب یہ وصیت پیش نظر رکھنی چاہیے۔

كلّموا الناس على قدر عقولهم	لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق گفتگو
أتريدون أن يكذّب الله ورسوله	کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے
	رسول جھٹلا دیے جائیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ان کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت از سر نو اچھی طرح راسخ کر دی جائے کہ اسلام زندگی اور توانائی صلاحیت سے بھرپور ہے، اور صرف یہی نہیں کہ اسلام زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے، بلکہ زمانہ کی قیادت و رہنمائی کر سکتا ہے۔ "صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ"

اس مقصد کے لئے ایسا اسلامی لٹریچر مفید ثابت ہو سکتا ہے، جو ان کے ذوق کے مطابق ہو، جو ان کے دماغ کی گرہیں کھول دے، مستقل کتابیں تصنیف کر کے

---

[1] ترکی، کسی زمانہ میں جس کی دینی پختگی اور اسلامی روایات سے وابستگی بطور مثال پیش کی جاتی تھی، اس مصیبت کی بہترین مثال ہے۔

شائع کی جائیں یا ملک کی رائج زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا جائے۔

اس مجلس میں استاذ احمد محمد جمال نے بھی گفتگو کی اور بعض اہم پہلو اجاگر کئے۔ اس کے بعد مذاکرہ شروع ہوا اور بعض ممتاز حاضرین نے تقریروں میں اپنے تاثرات بیان کئے...... ان میں وزارت اطلاعات و نشریات میں شعبۂ وعظ و ارشاد کے چیف ڈاکٹر [illegible]، اور شیخ محمد ہاشم مجددی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ہماری معروضات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بعض اہم نکتے واضح کئے۔ پھر مجلس برخاست ہوئی اور مسرت و طمانیت کا تاثر لئے ہوئے لوگ واپس ہوئے۔

وزراء اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقاتیں

جن ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی ان میں سب سے اہم وزیر تعلیم جناب محمد یٰسین عظیم اور نائب وزیر ڈاکٹر محمد صدیق ہیں۔ ان حضرات سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی اور اسلامی ممالک میں تعلیمی رجحانات اور وہاں کی تعلیمی سیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔ وزیر تعلیم نے ہماری باتیں توجہ سے سنیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھیں اپنی تعلیمی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ چونکہ ہمارے دورہ کا پروگرام مرتب کرنے اور وفد کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کرنے کا انتظام اصلاً وزارت تعلیم ہی نے کیا تھا اور یہی وزارت حکومت افغانستان کی طرف سے ہماری میزبان تھی، اس لئے ہم نے وزیر تعلیم اور نائب وزیر تعلیم کا خصوصی طور پر شکریہ ادا اور اپنی ممنونیت کا اظہار کیا۔ وزارت تعلیم نے ہمارے اعزاز میں ایک دعوت کا بھی اہتمام کیا۔ جس میں کلیۃ الشریعہ کے اساتذہ نمایاں نظر آتے تھے۔

صدر اعظم (وزیر اعظم) کے خصوصی مشیر استاذ عبد الستار سیرت سے بھی ملاقات

ہوئی وہ مصر کے تعلیم یافتہ اور جامع ازہر کے فارغ ہیں، وہ اہل زبان کی سی تیزی اور روانی کے ساتھ عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ وزارت عدل کے انڈر سکریٹری جناب سمیع الدین زوند اور نیابت عامہ کے انڈر سکریٹری عبد الرحمن ہدایت، منزل وقف بورڈ کے ڈائرکٹر استاذ کامل شفوری، اخوان جمعیۃ اسلامی کے صدر مولانا محمد صدیق کباری وغیرہ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، ان حضرات کے ساتھ وزارت عدل کے عہدہ داروں اور اس کے بعض شعبوں کے سربراہوں میں سے کچھ منتخب افراد بھی تھے، استاذ احمد جمال میرے کابل پہنچنے سے پہلے وزیر اطلاعات سے بھی مل چکے تھے۔ استاذ عبد الرسول سیاف تمام ملاقاتوں اور اجتماعات میں فارسی زبان میں قدرت اور مہارت کے ساتھ ہماری باتوں کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے تھے، یہ بات ہم نے خاص طور سے محسوس کی کہ تمام پڑھے لکھے افراد، وزراء اور اعلیٰ عہدیداران سب فارسی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، حالانکہ وہاں کی سرکاری زبان پشتو ہے، سرکاری احکام و اعلانات اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں، سرکاری مراسلات میں یہی زبان استعمال کی جاتی ہے، دعوت نامے بھی اسی زبان میں جاری ہوتے ہیں لیکن فارسی زبان سب لوگ سمجھتے ہیں اور علمی اجتماعات اور ادبی مجلسوں میں فارسی ہی استعمال کرتے ہیں، ہمیں بتلایا گیا کہ تحریک پختونستان کے مرکز اور بلوچستان کی سرحد سے ملے ہوئے علاقوں میں بھی فارسی ہی زیادہ رائج ہے۔

اس دورے میں جن ممتاز شخصیتوں سے تعارف حاصل کر کے خوشی ہوئی اور ان کے ساتھ زیادہ وقت گزرا ان میں مولانا محمد اسلام تسلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ ان علماء کا نمونہ ہیں جو دین میں رسوخ و استقامت کے ساتھ ہی جدید افغانستان میں اپنی عزت و احترام اور قدر و منزلت کو بھی باقی رکھے ہوئے ہیں۔

وزارت تعلیم کے بڑے بڑے ذمہ داران اور عہدہ داران ان کا احترام کرتے ہیں اور مولانا کو ان کا اعتماد حاصل ہے۔

قوم میں علماء کے اثرات کی روز افزوں کمی اور اس کے نتائج

افغانستان کچھ دنوں قبل علماء اور مشائخ کا ملک تھا، اور اس حد تک علماء کے زیر اثر تھا کہ دوسرے مشرقی ممالک میں اس کی مثال نہیں ملتی، کسی مذہبی شخصیت یا حکومت کے لئے علماء کی تصویب و تائید اسی طرح ان کی ناراضگی و ناپسندیدگی کی بڑی قیمت تھی اور اس کے دور رس اثرات مرتب ہوتے تھے اور حکومت اور قوم دونوں کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت تھی، علماء کے نعرۂ جہاد —— جس کو وہ عام طور پر "غزا" کہتے تھے —— کی صدائے بازگشت سے شہر قصبات اور دیہات گونج اٹھتے اور وہ عوام و خواص کے دلوں اور دماغوں میں آتش پیدا کر دیتا، انگریزوں سے جنگ، ملک کی آزادی و استقلال کی حفاظت، دینی و ملی غیرت کے بقاء، بہت سے اسلامی اخلاق و آداب پر قائم رہنا اور اسلام دشمن تحریکوں اور طاقتوں کا مقابلہ الحمدللہ علماء کے اثرات کا رہین منت ہے، اور شاید افغانستان میں شرعی عدالتوں اور اسلامی قوانین کے باقی رہنے کا بھی یہی سبب ہے جبکہ اکثر اسلامی ممالک میں ان کا خاتمہ ہو گیا ہے، اور بلاشبہ افغانی حکومت اس مسئلہ میں مبارکباد کی مستحق ہے۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ سیکڑوں افغانی طالب علم ہمارے یہاں ہندوستان کے بڑے مذہبی مدارس اور خاص طور سے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے کیونکہ افغان بھی ترکوں کی طرح سو فی صدی سنی حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ہمیں اس دورہ سے اندازہ ہوا کہ اب وہ نسل ختم ہو چکی ہے یا ختم کے قریب ہے۔

زمانہ کی رفتار اور حالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ علماء نے اپنا اثر و نفوذ بھی بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اس میں حکومت کے "مدبرانہ" طرزِ عمل کا بھی بڑا دخل ہے اور یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے۔ حکومت نے گزشتہ تجربات سے یقیناً سبق حاصل کیا ہوگا۔ اس نے دیکھا کہ علماء امیر امان اللہ خان کے خلاف کھڑے ہو گئے تو ان کے خلاف بغاوت ہو گئی یہاں تک کہ انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور شاید علامہ اقبال کی بیان کردہ ابلیس کی وہ حکیمانہ نصیحت بھی اربابِ حکومت کے علم میں آئی جس میں اس نے اپنے مطیع و فرمانبردار رہنماؤں سے کہا ہے۔

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو!

چنانچہ اب یہ دینی غیرت اور افغانی خودداری محسوس حد تک کم ہو گئی ہے۔ افغانی معاشرہ میں زبردست تغیرات رونما ہوئے۔ اور قوم ان کو ہضم کر گئی۔ ان میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی۔ وہاں بے پردگی کا سیلاب آ گیا۔ مغربی تہذیب کی تقلید اور فرنگیت عام ہو گئی اور وہاں کی زندگی میں کوئی حرکت یا کوئی اضطراب نہیں پیدا ہوا۔ اس وقت افغانستان ہپیوں کا بہت بڑا مرکز بنا ہوا ہے کیونکہ حشیش اور دیگر نشیلی اشیاء وہاں بافراط ملتی ہیں۔ ہم نے خود ان کی بڑی تعداد کو دیکھا وہ جہاز پر ہمارے ساتھ تھے، کابل میں اترے اور ادھر ادھر پھیل گئے۔ قوم کے اخلاق اور اختلاطِ مرد و زن پر پڑنے والے ان کے اثرات صاف ظاہر ہیں لیکن یہ تمام باتیں اب وہاں کوئی محسوس کی جانے والی ناپسندیدگی یا بے چینی نہیں پیدا کرتیں اور یہ دینی غیرت اور اسلامی نخوت کے زوال ہی کی دلیل ہے۔ اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ قیادت علماء کے ہاتھوں سے نکل کر سیاستدانوں کے ہاتھوں میں

چلی گئی ہے، جو ہر معاملہ کو اقتصادیات اور سیاست کی نظر سے دیکھتے ہیں اور "صورت حال" کے سامنے سر جھکا دینا ہی حقیقت شناسی کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

میں نے سنا کہ ہرات اب تک علم و علما اور مدارس و مساجد کا شہر ہے، وہاں اب بھی علم دین اور علما بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور صلاح و تقویٰ کے آثار موجود ہیں، شدید خواہش کے باوجود میں اس تاریخی شہر اور دینی و علمی مرکز کی زیارت نہیں کر سکا یہاں سے بہت سے علما اور مصلحین پیدا ہوئے، مثلاً مشہور عارف و محقق امام عبداللہ انصاری جن کی کتاب "منازل السائرین" کی شرح میں علامہ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب "مدارج السالکین" لکھی، اور مشہور محدث، فقیہ اور محقق علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد جو ملا علی قاری کے نام سے مشہور ہیں۔ (م ۱۰۱۴ھ)۔

کابل میں مجددی خاندان

دارالسلطنت اور اس کے مضافات میں قدیم علما و مشائخ کے خانوادہ کے کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں، اور درس و تدریس، اصلاح و ارشاد اور دعوت الی اللہ میں مشغول ہیں، کابل کے مضافات میں مجددی بزرگوں کی ایک خانقاہ "قلعہ جواد" کے نام سے مشہور ہے، اس کے بعض مشائخ کی شہرت افغانستان کے حدود سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی، اسی خانوادہ کے ایک بزرگ نورالمشائخ شیخ فضل عمر مجددی تھے، جو "شیر آغا" کے نام سے مشہور تھے، ان کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی، جو ہندوستان و پاکستان تک پھیلے ہوئے تھے[1]، ان کے بھائی شیخ محمد صادق مجددی المشرقی و سطی میں افغانستان کے

---

[1] ۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۵ھ میں انتقال ہوا، راقم الحروف نے لاہور اور کرسٹل میں ان کی زیارت کی ہے۔

سابق سفیر و رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے رکن ہیں۔ علم و صلاح و تقویٰ اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کی وجہ سے آپ ملک میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اس عوامی تحریک میں ان دونوں بھائیوں نے مرکزی اور قائدانہ کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجہ میں امیر امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا اور نادر شاہ تخت نشین ہوئے۔

ہم نے قلعۂ جواد کی بھی زیارت کی اور دیکھا کہ خانقاہ وابستگان و معتقدین سے بھری ہوئی ہے، مسجد نمازیوں سے آباد ہے، اور مدرسہ میں طلبہ کی کثیر تعداد تحصیل علم میں مصروف ہے، حضرت نور المشائخؒ کے خلیفہ اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد ابراہیم مجددی کئی بار ہمارے ہوٹل تشریف لائے اور ہم لوگوں پر بڑا کرم فرمایا، اسی طرح اس خاندان کے اور بھی بزرگوں مثلاً شیخ عبد السلام مجددی وغیرہ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور برادر عزیز صبغۃ اللہ مجددی کو تو ہم بھول ہی نہیں سکتے، ان کی نو عمری ہی میں ۱۹۵۱ء میں ان سے قاہرہ میں تعارف ہوا تھا، مسجد اقصیٰ میں ان کے دادا شیخ محمد صادق مجددی کی خلوت گاہ میں چند دن گذرے تھے، کابل میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، لمبی لمبی نشستیں رہیں، خوب خوب باتیں ہوئیں اور بیتے دنوں کی یاد تازہ کی جبکہ مسلمان زیادہ باعزت تھے اور ہمارے اعمال نامے زیادہ پاکیزہ اور روشن تھے، شیخ صبغۃ اللہ مجددی افغانستان جمعیۃ العلماء کے بانی اور اس کی مجلس تاسیسی کے رکن ہیں، بعض وزراء کے زمانہ میں عقیدہ و ایمان میں پختگی اور دعوت اسلامی کی وجہ سے انھیں سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہے، اسی طرح بزرگ و محترم دوست شیخ محمد صادق مجددی کے صاحبزادہ شیخ محمد ہاشم مجددی بھی بہت مانوس ہو گئے تھے، اور ان سے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئیں، یہ دونوں وزارت تعلیم سے متعلق ہیں۔

چند اور علمی و دینی شخصیتیں

مجاہد کبیر مولانا سیف الرحمٰن ٹونکی[1] مہاجر کابل کے صاحبزادے مولوی عبدالعزیز اور ان کے بھتیجے مولوی عزیز الرحمٰن کی ملاقات سے بھی بڑی مسرت ہوئی۔ مسجد پل خشتی کے امام مولوی غلام ربانی سے بھی ملاقات کا موقع ملا یہ دارالسلطنت کی سب سے بڑی جامع مسجد ہے، اور امام صاحب بڑے دلچسپ اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولوی محمد گل کی خدمت میں بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ افسوس ہے کہ بعض اور بزرگوں کے نام یاد نہیں رہے، انتہائی مشغول پروگرام اور مسلسل آمد و رفت میں لوگوں کے نام نوٹ کرنے اور یادداشت لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

---

[1] مولانا سیف الرحمٰن صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر ہندوستان کا رخ کیا۔ علوم ریاضی کی تعلیم مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور حدیث کی تحصیل مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے کی۔ سالہا سال ریاست ٹونک میں مدرسہ ناصریہ میں تدریس کی خدمت انجام دی، اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ فتح پوری میں بھی مدرس رہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے خصوصی تعلق تھا، اور وہاں کی مجاہدانہ تحریک کے خاص مددگار تھے۔ مولانا نے اسی مقصد کے ماتحت ہندوستان سے ہجرت کی، اور سرحد کے مشہور مجاہد حاجی ترنگزئی کی قیادت میں انگریزوں سے جنگ کی۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد کابل ہجرت کر گئے، جہاں وہ بعض اہم مناصب پر فائز رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پشاور واپس آ گئے۔ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۸ھ کو اپنے گاؤں متھرا میں وفات پائی، جو پشاور کے شمال میں واقع ہے۔ مولانا بڑے عالی ہمت، بلند نگاہ، ذہین و ذکی عالم تھے۔ انگریزوں کی دشمنی میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ان کے شاگردوں کی اچھی تعداد تھی۔

کابل کی جامع مسجد میں

کابل میں ہمیں ایک ہی جمعہ مل سکا، اور وہ ہم نے جامع مسجد پل خشتی میں ادا کیا، اس میں سعودی سفیر بھی تشریف لائے، مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، یہاں کے رسم کے مطابق ہم نے اور شیخ احمد محمد جمال نے نماز جمعہ سے پہلے تقریریں کیں، میں نے اپنی تقریر میں مشہور حدیث:-

بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا
اسلام کا آغاز عالم بیکسی سے ہوا اور پھر
کما بدأ فطوبی للغرباء۔
عالم بیکسی میں پہنچ جائے گا تو بیکسوں کو مبارکباد

کی تشریح کی اور تشریح کے دوران قدیم ترین اسلامی ممالک کو درپیش مصائب و مشکلات کی جانب بھی لطیف اشارہ کرتا جا رہا تھا کہ دین و مذہب جن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا وہ بھی اس وقت عقیدہ و ایمان کے سخت امتحان سے گذر رہے ہیں، اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، دوسری قوموں کی تقلید اور اسلام بیزاری کے رجحانات نے ان ممالک پر دھاوا بول دیا ہے، دوران تقریر اچانک ایک صاحب نے مسجد کے ایک گوشہ میں زور سے نعرہ لگایا اور ان کو حال آگیا: اس سے عالم اسلام کی موجودہ صورت حال پر غیرت مند مسلمانوں کے رنج و غم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

استاذ احمد محمد جمال نے حدیث "أتدرون من المفلس ...... الحدیث" اور "الدنیا سوق قامت ثم انفضت .... الحدیث" کی تشریح کی۔

آثار قدیمہ اور باغات

آثار قدیمہ میں سے ہم نے ہندوستان میں مغل سلطنت کے اولوالعزم بانی ظہیر الدین بابر

کی قبر کی زیارت کی، وہ ایک خوبصورت مقام پر گھنے باغ کے درمیان کابل کے قریب ہی ہے بابر کو کابل بہت پسند تھا تو اس نے اس کی آخری آرام گاہ کے لئے کابل ہی کو منتخب کیا، ہم پغمان کا مشہور باغ بھی دیکھنے گئے، وہ صحیح معنوں میں دنیا کے مشہور اور بڑے باغات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ اسی انداز پر کشمیر اور لاہور کے شالامار باغ لگائے گئے ہیں، یہ سب ہی مختلف تختوں اور روشوں میں منقسم ہیں، کاریز میر باغ بھی دیکھا، یہ بہت لمبا چوڑا اور گھنا باغ ہے، پانی وافر ہے، درخت گھنے ہیں اور بیچ بیچ میں پختہ سڑکیں ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کے دارالسلطنت میں

ہمارا یہ دورہ کابل اور اس کے مضافات کے اداروں، شخصیتوں اور تعلیمی و ثقافتی مراکز تک محدود تھا کیونکہ وقت کم تھا اور پروگرام بہت، لیکن میں نے وزیر تعلیم اور ان کے سکریٹری سے درخواست کی کہ ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا لہرانے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے والے، سکندر اسلام یمین الدولہ غازی سلطان محمود غزنوی کے دارالسلطنت غزنی کی زیارت کی بھی اجازت دیں، جہاں تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور شعر و ادب کی نئی تاریخ وجود میں آئی، جو چوتھی صدی ہجری کے آخری اور پانچویں صدی کے ابتدائی ایام میں ترقی اور عظمت وشان میں اندلس کے قرطبہ اور غرناطہ کی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا، اور اب عالیشان محلات، بازاروں، آبادی کی کثرت اور جدید تمدن کے مظاہر سے زیادہ تاریخوں، کہانیوں، کھنڈرات اور شکستہ در و دیوار میں زندہ ہے، اگر میں محمود غزنوی اور حکیم سنائی کا شہر نہ دیکھ سکا اور اپنے ملک لوٹ گیا تو میرا دورۂ افغانستان نامکمل رہ جائیگا

اور ایک دیرینہ تمنا دل ہی میں گھٹ کر رہ جائے گی۔ وزیر تعلیم نے میری تجویز بڑی خوشی سے منظور کر لی اور نائب وزیر تعلیم نے غزنی کے حاکم شہر اور محکمۂ تعلیم کو وفد کے استقبال کی ہدایتیں دیں اور تاکید کی کہ باخبر رہنما اور آثار قدیمہ کے ماہر ساتھ کر دیے جائیں جو شہر کے قدیم آثار تاریخی مقامات دیکھنے میں مدد دے سکیں۔

علمی و تمدنی تاریخ میں غزنی کا حصہ

سنیچر ۹ جون کی صبح کو ہم غزنی کے لئے روانہ ہوئے، وہ کابل سے ۱۲۰ کیلومیٹر (۷۵ میل) کے فاصلہ پر ہے، وہاں حاکم شہر اور وزارت تعلیم کے افسران نے ہمارا استقبال کیا تجربہ کار اور باخبر رہنما اور محکمۂ آثار قدیمہ اور کھدائی میں کام کرنے والے چند افراد کو ہمارے ساتھ کر دیا، اور ہم فوراً پرانے شہر کی طرف ہو لئے، وہ موجودہ شہر سے مشرقی جانب چند کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، یہاں اب صرف کھنڈر اور شکستہ در و دیوار رہ گئے ہیں، یہاں کسی زمانہ میں غزنوی سلطنت کا دار السلطنت تھا، جو اس وقت آبادی کی کثرت شہر کی وسعت اور تمدن کی ترقی میں عالم اسلام کے سب سے بڑے مرکز اور سلطنت عباسیہ کے پایۂ تخت دار السلام بغداد کا مقابلہ کر رہا تھا، اور پوری دنیا سے اہل فضل و کمال، علم و ادب کے ماہرین، نادر روزگار دستکار، فصیح و بلیغ شعراء، متبحر علماء، محققین اولیاء اصفیاء، ذہین و ذکی اور حاضر جواب درباری، حاذق اطباء اور تجربہ کار جنگ جو اور فاتحین اس کی طرف اس طرح کشاں کشاں چلے آ رہے تھے، جیسے لوہے کے ٹکڑے مقناطیس کی طرف کھنچتے ہیں، یہاں کے بازار نئی مصنوعات سے بھرے ہوئے تھے، مفتوحہ ممالک سے مال غنیمت وہاں کی قیمتی اور نایاب اشیاء اور نفیس ترین ساز و سامان

اس طرح وہاں پہنچ رہا تھا، جیسے ندی نالوں کا پانی سمندروں میں گرتا ہے، اس کی وجہ سے وہاں ایسی چیزیں جمع ہو گئی تھیں، جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں۔

آستانۂ غزنوی سے وابستگان و متوسلین میں بدیع الزماں ہمدانی جیسے ادیب شاعر ابوریحان البیرونی جیسا ریاضیات و فلکیات کا امام، لافانی شاعر فردوسی اور اس کے علاوہ عسجدی، عنصری، اسدی، غضائری، فرخی، منوچہری جیسے ممتاز فارسی شعراء شامل تھے، سلطان جن شعراء کی کفالت کرتے تھے ان کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے۔

غزنی کی بربادی

غزنی پوری ایک صدی تک شان و شوکت اور تمدن کی بلندیوں پر رہا، بیم و رجا، امر و نہی اور نفع و ضرر کا اصل مرکز بنا رہا، یہاں تک کہ ابھرتے ہوئے عالی ہمت غوری خاندان (جس میں بعد میں شہاب الدین غوری جیسا مجاہد پیدا ہوا) کے پے در پے حملوں کا شکار ہو گیا اس خاندان کا ایک فرد ــــ علاء الدین حسین بن حسن ــــ اپنے زمانہ کے غزنوی حکمران بہرام شاہ سے خار کھائے ہوئے تھا، کیونکہ بہرام نے اس کے بھائی سیف الدین کو سولی پر چڑھایا تھا، چنانچہ اس نے غزنی پر فوج کشی کی، غزنویوں کو شکست دے کر شہر میں داخل ہوا اور تین دن تک لوٹ مار کا بازار گرم رکھا، شہر میں آگ لگوا دی جو پورے شہر میں پھیل گئی، اور خشک و تر سب جل کر راکھ ہو گیا، یہ گلزار شہر کھنڈر میں تبدیل ہو گیا اور علاء الدین جہاں سوز کے لقب سے مشہور ہوا، یہ ۵۴۵ھ کا واقعہ ہے[1] اللہ نے سچ کہا ہے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ "زمین اللہ ہی کی ہے، جسے چاہتا ہے اس کا والی و وارث بناتا ہے"

---

[1] ملاحظہ ہو "البدایہ والنہایہ" جلد ۱۲

ان کھنڈرات سے گزرتے ہوئے ابو العلا معری کے یہ اشعار بے ساختہ ورد زبان تھے

خفف الوطأ ما أظن أديم الأ　　رض إلا من هذه الأجساد
وقبيح بنا وإن قدم العهد　　هوان الآباء والأجداد
سر إن استطعت في الهواء رويداً　　لا اختيالاً على رفات العباد

(زمین پر چلنے والو ذرا آہستہ چلو کیوں کہ میرے خیال میں روئے زمین ان خفتگان خاک کے جسموں کے علاوہ کچھ بھی نہیں، آباء و اجداد کو زیر زمین گئے ہوئے اگرچہ ایک زمانہ گزر چکا ہے پھر بھی ان کی توہین و تذلیل کوئی اچھی بات نہیں، اگر ہو سکے تو ان فضاؤں میں ہلکے قدموں چلو، فخر کے بندوں کی بوسیدہ ہڈیوں پر ٹہلتے ہوئے تو نہ چلو)

وہاں کھدائی میں بعض ایسی عمارتوں کے آثار بھی ملے ہیں جن کی تاریخ سلطان مسعود بن محمود و ان کے بعد کے لوگوں تک پہنچتی ہے، کھدائی کا کام ابھی جاری ہے، اور بعض ماہرین نے بتلایا کہ کہیں دس سال میں اس مدفون اور تباہ شدہ شہر کے آثار سامنے آ سکیں گے۔

حکماء، حکام، زاہدوں اور شہنشاہوں کے مزارات پر

حکیم سنائی[1] کی قبر پر ہم لوگ تھوڑی دیر ٹھہرے ان کے لئے دعا کی اور فاتحہ پڑھی

---

[1] حکیم سنائی کا نام مجدود تھا اور کنیت ابو المجد تھی، بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ کے ہیں، سن وفات میں اختلاف ہے ۵۲۵ھ ۵۳۵ھ اور ۵۴۵ھ کی مختلف روایتیں ہیں، یہ صوفیانہ شاعری میں صف اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں، سب سے پہلے انہی نے حسن اخلاق، تہذیب نفس اور انسانیت کی عظمت و احترام کو موضوع سخن بنایا اور اس پر شعر کہا، جوش، سچائی اور اثر انگیزی ان کے کلام کا امتیاز ہیں۔

یہاں یاد آگیا کہ علامہ اقبال نومبر ۱۹۳۳ء میں ان کی قبر پر آئے تو وہاں پھوٹ پھوٹ کر روئے اور اسی سے متاثر ہو کر اپنا بلند پایہ قصیدہ[1] کہا جس کا مطلع ہے ؎

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

اور اس کا آخری شعر ہے ؎

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

ہم نے چند اولیاء اللہ اور صالحین مثلاً سید بہلول دانا، سید علی لالا، خواجہ بلغار، اور شمس العارفین کے مزارات کی زیارت بھی کی۔

مجاہد اسلام، فاتح ہندوستان سلطان محمود غزنوی کی قبر پر بھی حاضری دی۔ آج کے لئے بڑی بڑی فوجوں کی قیادت، دوسرے ممالک میں دور تک بے خطر گھستے چلے جانا، پے در پے حملے اور جنگیں ایسی بے حقیقت و آسان تھیں، جیسے آج کے نوجوانوں کے لئے ایک بات یا صبح و شام چہل قدمی۔ انھوں نے ہندوستان میں اسلام کے قدم جما دیئے اور مسلم حکومت کی بنیادیں مستحکم کر دیں، جو مختلف خاندانوں کی شکل میں تقریباً آٹھ سو سال تک باقی رہیں۔ ہم مزار شاہی پر تصویر حیرت بنے کھڑے رہے۔ یہاں وہ شیر سو رہا ہے جس کی ہیبت سے افغانستان و ہندوستان کے بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی نیند اڑ جاتی تھی آج وہ خود محو خواب ہے۔ محمود کے درباری شاعر فرخی نے اس کی موت پر جو دل دوز مرثیہ کہا تھا اس کے یہ چند شعر حسب حال کی پوری تصویر ہیں

---

[1] یہ قصیدہ اقبال کے مجموعۂ کلام بال جبریل کے ابتدائی قصائد میں شامل ہے اور اس کی مختصر تشریح اور عمومی تبصرہ "اقبال غزنی میں" کے عنوان سے نقوش اقبال میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں ؎

خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند
ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار
کہ تواند کہ برانگیزد ازیں خواب ترا
خفتنی خفتی کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندیدست ترا زیں کردار

(ترجمہ) اے بادشاہ اٹھو! بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لائے ہیں۔

کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے، تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا۔

اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی، کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہ دیکھا تھا۔[1]

عبرت کا مقام

میں اس دورہ سے شکستہ خاطر اور ملول و غمگین لوٹا، اسلام کی عظمت اور اس کی ابدیت پر ایمان مزید مستحکم ہو گیا اور انسان کی کمزوری اس کی کوتاہ نظری اور مظاہر سے فریب خوردگی پر یقین تازہ اور پختہ ہو گیا۔ بڑے بڑے دارا سلطنتوں سے اعتماد اٹھ گیا جو آج آبادی کی کثرت

---

[1] ترجمہ: ماخوذ از شعر العجم

عمارتوں کے استحکام اور بنیادوں کی مضبوطی پر ناز کرتے ہیں اور جن پر ان کے سربراہوں اور مالک بسنے والوں اور ان سے متاثر و مرعوب ہونے والوں کو بڑا اعتماد ہے، اسی طرح بڑی آن بان کروفر، شان و شوکت، مال و لشکر، علم و فن، اثر و اقتدار، مضبوط قلعوں، محفوظ برجوں، عالی شان عمارتوں اور بڑے بڑے کارخانوں والے طاقتور اور وسیع و عریض ممالک پر سے کبھی عقیدہ اٹھ گیا میں نے سوچا کہ بغداد، غزنی، قرطبہ، غرناطہ، سمرقند اور بخارا کی تباہی و بربادی کے بعد ان موجودہ دارالسلطنتوں، شہروں، تہذیب و ثقافت کے مرکزوں اور ان حکومتوں کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے۔ بادشاہوں کے جاہ و حشم کے اس انجام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب بچوں کا کھیل اور اسٹیج کی نقالی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

اللہ نے سچ کہا ہے وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔

بیش قیمت کثیر معلومات، مشاہدات اور گوناگوں تاثرات و احساسات لئے ہم واپس آ گئے، گیسٹ ہاؤس میں دوپہر کا کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کیا اور ظہر کی نماز ادا کی۔ موجودہ شہر کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، اب یہ صرف دس ہزار سے زیادہ دو ہزار کی آبادی پر مشتمل ایک قصبہ رہ گیا ہے، کہاں یہ چھوٹا سا قصبہ اور کہاں وہ عظیم الشان شہر، رہے نام اللہ کا۔ رات اور دن کا الٹ پھیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور گردش روزگار اسی کا تابع فرمان!

ملک محمد ظاہر شاہ اور سردار داؤد خاں

امید قوی تھی کہ وفد کو شاہ سے بھی ملاقات کا موقع دیا جائے گا، رابطہ عالم اسلامی کے

وفود نے جن ممالک کے دورے کئے وہاں کے بادشاہوں یا سربراہان مملکت سے ملاقاتیں کیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ تشریفات کے ذمہ داروں نے اسے پسند نہیں کیا۔ ہم نے سنا کہ شاہ کو بالکل اخیر میں وفد کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہا کہ پہلے سے کیوں نہیں بتلایا گیا جب کہ وقت میں گنجائش تھی؟ شاہ قوم سے بالکل الگ تھلگ اپنے محل میں زندگی گذارتے ہیں۔ باہر بہت کم نکلتے ہیں، دوسرے ممالک کے بعض مسلمان بادشاہوں کی طرح ان کی زندگی قومی اور عوامی بالکل نہیں۔ سعودی سفیر شیخ محمد شبیلی نے بتلایا کہ انھوں نے شاہ کو صرف ایک بار دیکھا ہے جبکہ انھوں نے اپنے اسناد سفارت پیش کئے تھے۔

میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ مغربی تہذیب کے قبول اور اس کی ظاہری چمک دمک کی طرف ملک کے بے تحاشا بھاگنے، افغانی عورت کے بے پردہ ہونے اور ملک کے پورے طور سے کمیونسٹ بلاک میں شامل ہونے کے پس پردہ کس کا ذہن کارفرما ہے؟ تو ان لوگوں نے شاہ کے چچازاد بھائی اور بہنوئی سردار محمد داؤد خان کا نام لیا۔ ہم پغمان گئے تو لوگوں نے ان کے محل کی طرف اشارہ کرکے بتلایا کہ یہاں ایک مذہبی مدرسہ تھا، داؤد خان نے دوسری جگہ منتقل کرادیا، اور خود وہ جگہ اپنے محل کے لئے منتخب کرلی۔ میں نے محسوس کیا کہ مذہبی رجحان رکھنے والے اور دین پسند لوگ ان کے رجحانات اور سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے، یہ بھی معلوم ہوا کہ تحریک پختونستان کے اصل روح رواں اور سب سے زیادہ سرگرم مؤید و حامی یہی ہیں۔[1]

---

[1] کابل سے گئے ہوئے صرف پانچ ہفتے ہوئے تھے اور ہم لوگ کویت میں تھے کہ اچانک کابل میں انقلاب کی خبر ملی، شاہ سرکاری دورہ پر اٹلی گئے ہوئے تھے، ان کی عدم موجودگی میں فوج نے ان کو معزول کر دیا، معلوم ہوا کہ اس انقلاب کے بانی مبانی سردار محمد داؤد خان تھے اور وہی سب سے پہلے صدر جمہوریہ منتخب کئے گئے۔

مسلم ممالک کی ذمہ داری

کمیونزم یا لادینیت کی گود میں پناہ لینے، مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر پر ٹوٹ پڑنے اور مغربی قوموں کی ہمرکابی اختیار کرنے کی ذمہ داری صرف افغانستان ہی پر نہیں ہے بلکہ افغانستان کے ساتھ ہی پورا عالم اسلامی اس سے بری نہیں ہو سکتا، سب جانتے ہیں کہ افغانستان کے ذرائع آمدنی محدود ہیں، یہ کثیر وسائل، معدنی دولت یا سیال سونے والا کوئی سرمایہ دار ملک نہیں، اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں جس کی وجہ سے درآمد برآمد کی آزادی سے بھی محروم ہے، ملک کی معاشیات کی بنیاد خشک میوہ جات، بھیڑ کے اون اور اس کی کھالوں کی برآمد ہونے والی محدود آمدنی پر ہے اور فطری طور سے وہ اپنی مالی دشواریوں پر قابو پانے اور ترقیاتی، تعلیمی اور رفاہی منصوبوں کے لئے ایسے ترقی یافتہ اور دولت مند ممالک سے امداد طلب کرنے پر مجبور تھا جن کے پاس دولت کی فراوانی اور برآمدی مصنوعات کا وافر ذخیرہ ہے ـــــ اگر اللہ نے پیسے اور دولت مند اسلامی ممالک کو توفیق دی ہوتی کہ وہ افغانستان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتے اور اس کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے مدد دیتے تو اسے بڑی طاقتوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ اپنے اسلامی کردار کی حفاظت کرتا اسے مزید فروغ دیتا ہوئے عالم اسلامی کی کمک دیتا، اس کی قوت و طاقت اور عزت و سربلندی کا سرچشمہ ثابت ہوتا اور اسلامی غیرت اور دینی جوش و جذبہ سے مالا مال یہ قدیم مسلم قوم فکری تہذیبی حملوں کا شکار ہونے سے محفوظ ہو جاتی۔

لیکن افسوس ہے کہ دولت مند مسلم ممالک ترقی پذیر ممالک کی امداد و تعاون سے ابھی تک غافل ہیں، سوویت یونین اور سرخ چین صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لئے

سامنے آگئے[1] افغانستان کے منصوبوں کی تکمیل اور ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے گراں قدر امداد کی پیشکش کی لازمی بات تھی کہ فکری، ثقافتی اور سیاسی تمام میدانوں میں اس امداد و تعاون کا موافق رد عمل سامنے آتا چنانچہ افغانستان زندگی کے تمام شعبوں میں انہی ممالک کے تعاون سے فائدہ اٹھانے لگا۔

افغانستان علمی اور ثقافتی اعتبار سے عالم اسلام سے بالکل الگ تھلگ رہا بعض سیاسی اسباب کی بنا پر جب ایک مسلم ملک پاکستان سے اس کے تعلقات کشیدہ رہے، راستے میں پاکستان کے حائل ہونے کی وجہ سے ایک بڑے تہذیبی مرکز ہندوستان سے الگ رہا، مجبوراً اسے قدیم علمی ورثہ پر قناعت کرنا پڑا، جدید علمی و دینی سرگرمیوں اور پیش رفت سے اس کا مضبوط اور براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا، اور اگر مصر اور اس کا جامع ازہر نہ ہوتا (جہاں آج بھی افغانی نوجوان جاتے ہیں اور تحصیل علم کرتے ہیں اور مصر میں قیام کے دوران ادب اسلامی اور فکر اسلامی کے جدید افکار و رجحانات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں) تو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی تحریکوں سے افغانستان کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا اور وہ آہنی دیوار کے پیچھے بہت ہی تنگ اور محدود دائرے میں زندگی گذار رہا ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس وقت جو بھی پختہ فکر و خیال کے نوجوان نظر آتے ہیں، وہ ازہر ہی کے تعلیم یافتہ ہیں اور مصر میں ایک عرصہ تک قیام کر چکے ہیں۔

---

[1] باخبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ افغانستان نے اول اول امریکہ سے امداد کی درخواست کی تھی، لیکن اس نے عدم دلچسپی یا تنگ دلی کا مظاہرہ کرکے امداد سے انکار کر دیا، روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور امداد لے کر پہنچ گیا، اسی طرح امریکہ نے اور بھی مشرقی ممالک کو روسی بلاک میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

سعودی سفارت خانہ کی طرف سے اعزازی دعوت

افغانستان میں سعودی عرب کے سفیر شیخ محمد حمد شبیلی نے ہوٹل کابل میں —— جہاں ہم مقیم تھے —— وفد کے اعزاز میں اتوار ۹ جون کی رات کو ایک پرتکلف عشائیہ دیا، مقصد یہ تھا کہ شہر کے معزز و ممتاز افراد سے ملاقات و تعارف ہو سکے۔ اس میں کابل میں مقیم عرب ممالک کے تقریباً تمام سفراء، افغان کابینہ میں شامل چند وزراء، کابل کے گورنر، شاہی خاندان کے بعض افراد، کابل یونیورسٹی کے پروفیسر، دیگر علماء و مشائخ، سفارت خانوں سے متعلق بعض عرب علماء، فضلاء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات مدعو کئے گئے تھے۔ محترم سفیر نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں مہمانوں کا استقبال کروں، ان سے خطاب کروں اور موقع کی مناسبت سے وفد کے احساسات اور اس کے پیغام کی وضاحت کروں۔ حسب توفیق الٰہی اپنی باتیں پیش کیں اور رسمی شکریہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس قیمتی اور صاحب دعوت انسان کے لئے یادگار موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس گفتگو میں فکری و سیاسی اور جذبات و احساسات کے اظہار کے ساتھ بعض اس سے زیادہ اہم، نتیجہ خیز اور مفید باتیں بھی شامل تھیں۔ اپنی یادداشت پر اعتماد کر کے بعد میں یہ تقریر لکھوا دی اور چند صفحات کے بعد قارئین کی نظر سے گذرے گی۔

میرے بعد استاذ احمد محمد جمال کھڑے ہوئے اور مختصر مگر جامع اور بلیغ تقریر کی۔ افغانی قوم اور حکومت کی جانب سے وفد کے استقبال، مہمان نوازی اور پرخلوص توجہ کا شکریہ ادا کیا، اسی طرح دعوت قبول کرنے والے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، رابطہ عالم اسلامی کے اغراض و مقاصد واضح کئے، اتحاد اسلامی کے لئے شاہ فیصل کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کیا اور تبلیغ اسلام اور شہادت حق کے لئے علماء کی ذمہ داریاں

بیان کیا۔

پھر لوگ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر خوش و مسرور اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ یہ کابل میں آخری ملاقات تھی، اگلی صبح ۱۱ر جون [illegible] کو ایران کی طرف سفر کرنا تھا۔

یہاں کابل کی دو تقریریں شامل اشاعت کی جا رہی ہیں، جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، اور اب اگلی ملاقات تہران میں ہوگی۔

* * *

افغانی قوم کے انقلاب
اور
ان کی قوت کا سرچشمہ

(یہ تقریر کابل یونیورسٹی کے ہال میں، اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد اور سعودی سفیر کی موجودگی میں کی گئی، ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا)

حمد و صلوٰۃ کے بعد:۔

محترم سفیر صاحب سعودی عرب، وائس چانسلر، سربراہان شعبہ جات،
اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ!

اس وقت میرا دل مسرت کے جذبات سے لبریز ہے کہ ان روشن اور تابناک چہروں اور عزیز و محترم حضرات کے سامنے کھڑے ہونے کا زریں موقع نصیب ہوا، عرصے سے میرے دل میں یہ تمنا کروٹیں لے رہی تھی کہ اس عزیز و محبوب ملک کو قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل کروں جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا، بہت کچھ پڑھ چکا تھا اور میں کہہ سکتا ہوں ـــ جیسا کہ بعض مواقع پر کہا بھی ـــ کہ اس کی تاریخ میں، اس کے غزوات اور اس کی فتوحات کی داستانوں میں، میں نے زندگی گذاری ہے

اس کی جینیس اور عبقری شخصیتوں، فتح و ظفر سے بہرہ مند سورماؤں اور غیر معمولی افراد کے حالات و تراجم میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا ہے جنہوں نے علم اور اسلام کے نور سے ان سر بفلک پہاڑوں کے اس پار ہندوستان اور اس کے پڑوسی ملکوں کو منور کیا۔ اس لئے سعادت و مسرت کا احساس نہ غیر فطری ہے نہ اس میں کوئی تعجب کی بات ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں جذبات ہیں جو ان پہاڑوں کے دامن میں بسنے والے مسلمان بھائیوں سے ملاقات کے وقت ابل رہے ہیں، ابل رہے ہیں۔ دوگونہ مسرت اس پر ہے کہ آپ حضرات نے اس مجلس میں شرکت اور خطاب کا موقع عنایت فرمایا۔ میں اپنے دورۂ افغانستان، اس ملاقات اور اس مجلس میں شرکت کا موقع دینے پر صمیم قلب سے آپ حضرات کا شکر گذار ہوں۔

محترم حاضرین! آپ حضرات اور خاص طور سے ادب اور تاریخ کا ذوق رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ افغانی قوم ان قدیم اقوام میں سے ہے جو سیکڑوں اور ہزاروں سال سے آزادی اور عزت و سربلندی کی زندگی گذار رہی ہے اللہ تعالیٰ نے قدیم زمانہ ہی سے اسے غیر معمولی انسانی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ دوستو! میرا ذوق تاریخی رہا ہے اور میں اس کے اظہار میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا کہ تاریخ ہی کے مطالعہ و تحقیق میں میری عمر گذری ہے۔ یہی میرا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ میں اپنے تاریخی ذوق سے مجبور ہو کر آپ حضرات کے سامنے یہ سوال رکھنا چاہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ صدیوں تک افغانی قوم دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہی، دنیا میں گذرنے والے خیر و شر، نیک و بد، فتح و شکست اور ظلم و ستم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، اس جمود و غیر قیادت کی مستحق زندگی سے بھر پور

دست و بازو کی طاقت اور جذبے کی فراوانی سے بہرہ ور، باصلاحیت اور باعزت قوم کے طویل عرصہ تک دنیا سے کنارہ کش رہنے، اپنے خول میں بند رہنے اور ایک گوشہ میں محدود رہنے کا راز کیا ہے؟ کیا اس عزلت اور گوشہ نشینی کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان اور دنیا کے دوسرے ممالک کے درمیان بلند اور دشوار گذار پہاڑوں کی ناقابل عبور دیوار حائل تھی؟ نہیں میرے دوستو! تاریخ کی شہادت تو یہ ہے کہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے برف پوش اور دشوار گذار پہاڑ کبھی بھی غازیوں اور اولوالعزم فاتحین کی راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکے آپ حضرات واقف ہیں کہ یہ ناقابل عبور اور پیچ در پیچ راستے جن میں انسان کی عقل جواب دے جاتی ہے، جو افغانستان کو ہندوستان اور پاکستان سے الگ کرتے ہیں، جب اللہ نے اس امت میں سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین محمد غوری اور احمد شاہ ابدالی جیسے صاحب عزم و ہمت پیدا کئے تو یہ اونچی اونچی چوٹیاں، خطرناک گھاٹیاں اور یہ دشوار راستے اسلام کے سیل رواں کے سامنے حقیر تنکے ثابت ہوئے ——— پھر کیا یہ قوم قید و بند کی زندگی گذار رہی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، بارہا یہ قوم اپنی شجاعت کے جوہر دکھا چکی تھی۔ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکی تھی لیکن اس کے باوجود سرسبز و شاداب چراگاہیں، جھیلیں' اور زرخیز کھیتوں جیسے محدود وسائل زندگی پر قانع کیوں تھی؟ اس کا جواب آپ کے ذمہ ہے۔

پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ تاریخ میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب اسلام اس علاقہ میں آیا تو اچانک یہ قوم ہزاروں سال کی نیند سے بیدار ہو گئی، اور اتنی لمبی چھلانگ لگائی جس کی دوسری قوموں میں مثال نہیں ملتی، اسلام کے زیر سایہ آتے ہی یہ لوگ سب کے

زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ بہادر، سب سے زیادہ بلند ہمت، دور بیں اور فولادی عزائم کے مالک نظر آنے لگے، یہ قوم بزم کائنات میں شامل ہوئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مدفون خزانہ یا کوئی سربستہ راز تھا جو اچانک منکشف ہو گیا، کیا ان کے جسموں سے بجلی کا کرنٹ چھو گیا تھا یا کوئی جادو کی چھڑی تھی جس نے آن کی آن میں اس قناعت شعار، ٹھہری ہوئی، پرسکون اور عزلت گزیں قوم کو غیور و جسور، ظفرمند اور رواں دواں قوم میں بدل دیا؛ کیا اس طوفانی ندی کے راستے پر کوئی بڑی سی چٹان پڑی ہوئی تھی، جو اس کے زور اور روانی کو روکے ہوئے تھی؟

افغانیوں کی زندگی کے انقلاب کا حقیقی سبب اور اس کی شاہ کلید یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو اسلام کی برکت سے تین بنیادی اور اہم جوہروں سے نوازا۔

۱۔ طاقتور پیغام اور اس کے اغراض و مقاصد۔

۲۔ نوع انسان، خارجی دنیا اور حقائق اشیاء کے بارہ میں وسیع نقطۂ نظر۔

۳۔ اللہ کی مدد و تائید پر کامل اعتماد اور جدوجہد کے نتائج پر یقین۔

یہ وہ تین عناصر ہیں جن سے قوم کے کردار کی جدید تشکیل ہوتی ہے، اس کو نئی زندگی ملتی ہے، اور وہ نئی تاریخ بناتی ہے، اور اپنی مخفی طاقتوں اور نامعلوم وسعتوں سے دنیا کو حیران و ششدر کر دیتی ہے۔

پہلے اس قوم کے پاس کوئی پیغام یا کوئی بلند مقصد نہیں تھا؛ ایک چھوٹے سے علاقہ تک محدود تھی، اپنے جانوروں اور مویشیوں میں مگن رہتی تھی، اکثر آپس ہی میں برسرِ پیکار رہتی تھی، اور جیسا کہ ایک عرب شاعر نے کہا ہے ؂

واحیانا علی بکر اخینا
اذا ما لم نجد الا اخانا

(اور جب جنگجو فطرت کو جوہر دکھانے کے لئے کوئی دشمن نہیں ملتا تو ہم
اپنے بھائی بندوں ہی کو تاکتے ہیں)

اور جنگوں اور آویزشوں کا انجام اخلاقی اور روحانی بے مائگی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، زمانہ جاہلیت میں عرب خانہ جنگی میں مصروف رہتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو تاخت و تاراج کرتا، ایک شاخ دوسری شاخ پر دھاوا بولتی، اور ایک خاندان، دوسرے خاندان کی تاک میں رہتا، اسی طرح افغانیوں کے سامنے بھی اپنی خون آشام فطرت کی تسکین، اپنی جنگ کی پیاس بجھانے، اور خطر پسند طبیعت کو مطمئن کرنے کے لئے خانہ جنگیوں، چراگاہوں اور جانوروں کے لئے لڑائیوں، قبائلی یا انفرادی غیرت و نخوت کے اظہار یا نام نہاد اور خیالی اہانتوں کا بدلہ لینے کے لئے برسرِ پیکار ہونے کے علاوہ اور کوئی میدان نہیں ملتا تھا، ایک عرب شاعر نے حقیقت کی صحیح ترجمانی کی ہے۔

النار تا کل نفسہا
ان لم تجد ما تأ کلہ

(آگ کو جلانے کے لئے کچھ نہیں ملتا تو خود اپنے آپ کو جلا ڈالتی ہے)

لیکن جب اسلام آیا تو عربوں کے سامنے ایک بلند مقصد اور انسانیت کے لئے ایک طاقتور پیغام آگیا یہی حال افغانیوں کا ہوا، اسلام سے پہلے یہ صرف اپنے لئے زندگی گذار رہے تھے، اور اب اللہ کا یہ فرمان ان کے کانوں کی راہ سے دل میں اتر رہا تھا

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تم بہترین امت ہو، انسانوں کیلئے خاص طور پر

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔
(آل عمران۔۱۱۰)

بنائے گئے ہو، بھلائیوں کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور ان کے ذہن و دماغ میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ وہ باغوں اور کھیتوں میں آپ سے آپ اُگ جانے والے خود رو گھاس پھوس نہیں ہیں، بلکہ بجائے خود مقصود و مطلوب ہیں، ان کے ساتھ بلند مقاصد ہیں، ان کی ذمہ داریاں ہیں، جد وجہد اور کارکردگی کے نشانے متعین ہیں، ان کے دلوں میں یہ بات جم گئی کہ وہ ایسی امت ہیں جو انسانوں کے لئے خاص طور سے بنائی گئی ہے، جو لوٹ مار اور خونخواری کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے آپ سے آپ نہیں پیدا ہوئی ہے، تو ان کی زندگی، ان کے خیالات اور رجحانات میں زبردست انقلاب آگیا، اب وہ اپنا مقصد وجود اور اپنی زندگی کی غرض و غایت یہ سمجھنے لگے کہ دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لئے جد وجہد کریں، اور اس راہ میں قربانیاں دیں، یہاں تک کہ عبادت صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہو جائے، اور انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر اجالے میں لائیں، بندوں کی غلامی سے نجات دلائیں اور خدائے واحد کے آستانۂ عالی پر پہنچائیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعت سے روشناس کرائیں، اور دوسرے مذاہب کی زیادتیوں سے آزاد کرا کے اسلامی عدل و مساوات کے زیر سایہ لائیں۔

حضرات! اس قوم کے پاس کوئی پیغام نہیں تھا، اسلام آیا تو ایک بلند پیغام اور زندگی کا بلند مقصد اس کے سامنے آگیا، اس نے اسلام کے ابدی پیغام کو اپنے سینے سے لگا لیا ——— اور اسی نے ان میں نئی روح پھونک دی، وہ بدترین جہالت اور گمراہی

تاریکی میں زندگی گذار رہی تھی، خرافات اور حماقتوں میں بھٹک رہی تھی، ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتا تھا، طاقتور، کمزور کو نگل جانے کی کوشش کرتا تھا حقوق پامال ہو رہے تھے، عزتیں لٹ رہی تھیں اور ہر طرح کے جذبات وخواہشات پوری کی جاتی تھیں کہ اچانک ان کے جسم میں ایک نئی روح دوڑ گئی، ان کے افکار وخیالات، احساسات اور اعصاب پر چھا گئی اور اب وہ نئی قوم تھے، نئے انسان تھے۔ ان کی زمین وہی تھی آب وہوا وہی تھی، دست وبازو وہی تھے، لیکن اس جدید پیغام نے انھیں جدید امت بنا دیا۔

دوسرا عنصر یہ ہے کہ افغانی بہت تنگ اور محدود زندگی گذار رہے تھے، کائنات اور انسان کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر بہت محدود تھا، انسان کون ہے؟ افغانی انسان ہیں، جو اس علاقہ میں رہتے سہتے ہیں، یہاں کی زبان بولتے ہیں، اس ملک کا لباس پہنتے ہیں، اس کی محبت کے گیت گاتے ہیں، اسی تنگ نقطۂ نظر نے انھیں اس تنگ دائرہ میں محدود کر رکھا تھا۔

اسی طرح زندگی کیا ہے؟ کھانا، پینا، عیش وآرام! قوت وشوکت، حکومت وریاست، وہ اسی طرح زندگی گذارتے تھے، جیسے مچھلیاں یا مینڈک تالابوں میں جیتے ہیں، اسلام سے پہلے عرب، ترک اور ایرانی سب کا یہی حال تھا، اسلام ہی نے ان سب کو اس تنگ وتاریک قید خانہ سے نکالا جیسا کہ ایک عرب قاصد نے شاہ ایران سے کہا تھا۔

لنخرج من شاء الله من ضيق الدنيا	جس کو اللہ توفیق دے اسے ہم دنیا کی تنگی سے
الی سعة الدنيا والآخرة۔	نکال کر دنیا وآخرت کی وسعت میں پہنچا دیں۔

حضرات! آپ کے آباء واجداد انسان کے بارہ میں بہت تنگ نقطۂ نظر رکھتے تھے اس میں اعلیٰ ظرفی نہیں تھی، بلند نگاہی نہیں تھی، اس میں گہرائی نہیں تھی، اسلام نے ان کو

وسیع نقطۂ نظر عطا کیا، تو ان کی نگاہوں میں تمام انسان ایک خاندان اور پوری دنیا ایک گھر ہوگئی، اور رسول اللہ کا یہ فرمان ان کا عقیدہ بن گیا۔

کلکم من آدم وآدم من تراب لا فضل لعربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی الا بالتقوی۔	تم میں کا ہر ایک آدم کی اولاد ہے اور آدم مٹی سے بنے ہیں، نہ تو کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو کسی عربی پر مگر تقوی کے اعتبار سے۔

پھر ان کا نقطۂ نظر اتنا وسیع ہوگیا کہ وہ نہ جغرافیائی حدود کو تسلیم کرتے تھے، نہ خود ساختہ اور بے دلیل تقسیمات کو۔ مسلمان ان حدود سے نکل کر وسیع کائنات میں آگئے، اور اگر یہ وسیع نقطۂ نظر نہ ہوتا تو وہ بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح صدیوں تاریکیوں میں بھٹکتے رہتے۔

تیسرا عنصر یہ مضبوط و مستحکم اعتماد۔ جب وہ خدائے واحد پر ایمان لے آئے، اس کے رسول اور آخرت پر ایمان لے آئے، قضا و قدر پر ایمان لے آئے اور یہ سمجھ گئے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، اس سے نہ ایک لحظہ پہلے آسکتی ہے، نہ مؤخر ہو سکتی ہے، اور انھوں نے اللہ کا فرمان سنا اور اس کو دل میں بسا لیا کہ:

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء۔ ۷۸)	تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں بھی تم کو موت آ دبا وے گی اگرچہ تم قلعی چونے کے قلعوں ہی میں ہو۔
إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً	جب ان کا معین وقت آپہنچتا ہے تو (اس وقت) ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے

وَلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (یونس۔۴۹)	اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔

اس ایمان نے ان کو خود شناسی اور خود اعتمادی عطا کی وہ یہ سمجھ گئے کہ انسان کی موت اسی وقت آسکتی ہے جو اللہ نے مقرر کر رکھا ہے تو انھوں نے اس کا بھی یقین کر لیا کہ دنیا میں ہر ایک کی موت کا وقت مقرر ہے اور ہر چیز اللہ ہی کے دست قدرت و اختیار میں ہے۔

پھر انھوں نے مزید خود اعتمادی اس آسمانی پیغام سے حاصل کی کہ ان کی حیثیت خدا کی فوج کی ہے اور وہ اللہ اور اس کے دین کے معین و مددگار ہیں۔ انھوں نے اللہ کا یہ فرمان سنا۔

إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت۔۱۷۲،۱۷۳)	بے شک وہی غالب کئے جاویں گے اور ہمارا (تو قاعدہ عام ہے کہ) ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔
أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (المجادلہ۔۲۲)	خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے۔
إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ ۝ (المؤمن۔۵۱)	ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی میں گواہی دینے والے (یعنی فرشتے جو کہ اعمال لکھتے تھے) کھڑے ہوں گے۔
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنٰفقون۔۸)	(بلکہ) اللہ کی ہے عزت (بالذات) اور اس کے رسول کی (بواسطہ تعلق مع اللہ کے) اور مسلمانوں کی (بواسطہ تعلق مع اللہ والرسول کے)

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٥ (آل عمران ـ ١٣٩)

اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

اور اسی طرح کی دوسری آیتیں ان کے کانوں میں پڑیں تو اس سے ان کے یقین و اعتماد میں مزید قوت و استحکام پیدا ہو گیا۔

اس موقع پر میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اسلامی لشکر کے ساتھ موجیں مارتے ہوئے دجلہ کے سامنے پہنچے تو ایک لمحہ کے لئے رکے، موج بلاطم اور طوفان در آغوش دریا کا جائزہ لیا، گرد و پیش پر نظر ڈالی پھر حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان سے مشورہ کیا کہ بپھرے ہوئے دریا میں گھس پڑیں یا لوٹیں اور اسے عبور کرنے کے لئے پل کا انتظام کریں؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت جو لافانی جملہ کہا تاریخ نے اسے محفوظ کر لیا ہے، انھوں نے کہا:۔

"یہ دین تازہ اور نیا ہے، اسے مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ اس دین کو ضرور غالب کرے گا، اور ابھی اس حد تک نہیں پہنچا ہے جہاں تک پہنچنا اس کے لئے مقدر کیا گیا ہے، پھر میں کیسے یہ سمجھ لوں کہ اس پیغام کے حامل غرق ہو جائیں گے۔"

حضرت سلمان فارسیؓ کا یہ جملہ اپنے اندر بڑے گہرے معانی و حقائق رکھتا ہے کہ جب یہ دین بالکل نیا اور تازہ ہے تو یہ ضروری ہے کہ دنیا کی تعمیر، کائنات کی قیادت اور انسانیت کی ہدایت و رہنمائی میں اپنا کردار ادا کرے، چنانچہ امیر لشکر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فوج کو حکم دیا کہ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں اور اسے پار کر جائیں، مورخ طبری کی روایت ہے کہ ایرانیوں نے ان کو دیکھا تو چیخ پڑے "دیوان آمدند، دیوان آمدند" کہ یہ انسان نہیں جن اور بھوت ہیں، یہ اعتماد اور یقین تھا جو ان کے دلوں میں رچ بس گیا تھا

اور ان میں نئی روح ڈال دی تھی۔

افغانی نوجوانو، اور دوستو! آؤ اور اپنی تاریخ پر نظر ڈالو، سلطان محمود غزنوی کس طرح وسیع و عریض ممالک کو فتح کرتا چلا گیا؟ تاریخ بتلاتی ہے کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور اندرون ملک گھستا چلا گیا، یہاں تک کہ مشرق اور جنوب کی آخری سرحدوں تک پہنچ گیا، حالانکہ اس کے پاس نہ رسد کا انتظام تھا نہ کمک کا امکان، اس کا مرکز بہت دور تھا، درمیان میں سر بفلک پہاڑ، دشوار گذار راستے اور تنگ گھاٹیاں حائل تھیں، وجہ یہ ہے کہ ان جنگوں اور حملوں کی اس کے نزدیک اتنی ہی اہمیت تھی جتنی اہمیت ایک ماہر اور مضبوط کھلاڑی پیچ یا کھیل کے میدان کو دیتا ہے، وہ اللہ پر کامل اعتماد رکھتا تھا پھر یہ سمجھتا تھا کہ جہاد عبادت ہے، اور اس راہ میں موت شہادت، اور شہداء مرتے نہیں بلکہ انھیں حیات جاودانی حاصل ہو جاتی ہے، اور ان کے رب کی جانب سے ان کو روزی ملتی رہتی ہے، وہ اس پر سچا اور پختہ ایمان رکھتا تھا کہ وہ اللہ کے پیغام کا حامل اور امین ہے، اور ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرے گا۔

حضرات! جن عناصر کا میں نے تذکرہ کیا ہے، وہ افراد ہی کی تعمیر میں نہیں بلکہ قوموں کی تشکیل میں بھی زبردست رول ادا کرتے ہیں، شخصیت کی تعمیر کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے، اور نفسیات اور تعلیم و تربیت کے ماہرین نے اسے اپنا موضوع بحث بنایا ہے، لیکن میں اس وقت قوموں کے کردار سے متعلق گفتگو کر رہا ہوں، انھیں عناصر نے افغانی قوم کو بلند بالا حیثیت دی جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، جسے شکست نہیں دی جا سکتی، اور جب قومیں شخصیت کی تعمیر کرنے والے ان عناصر سے محروم اور ان قوتوں سے خالی ہو جاتی ہیں تو انجام شکست و ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر

افغانی قوم اپنی ان بلند تصورات اور تابناک خصوصیات سے محروم نہ ہو جائے کہ خدا نخواستہ وہ دور پھر واپس نہ آجائے جب وہ اسلام سے ناآشنا اور اسلامی دعوت سے بے بہرہ تھی۔

میں نوجوانوں سے خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی قوم کے دلوں میں ایمانی عناصر کو بہت جگا دو اور ان کو پروان چڑھاؤ ان کی حفاظت کرو، ضائع نہ ہونے دو، کیوں کہ قدیم ترین زمانے سے قوم وہی ہے پہاڑیاں اور گھاٹیاں وہی ہیں آسمان وہی، دریائے کابل ہزاروں سال سے اپنی گزرگاہ پر بہہ رہا ہے، یہاں کی سرزمین جسے اللہ نے بے بہا نعمتوں سے نوازا ہے، وہ بھی وہی ہے، خوش ذائقہ پھل، لذیذ میوہ جات، شیریں پانی یہ ساری نعمتیں اور نوازشیں ہزاروں سال سے بدستور ہیں لیکن اصل مسئلہ قوم کی تعمیر کے عناصر کا ہے، پیغام مقصد زندگی، خود اعتمادی اور کارگزاری کے نشانات کا ہے، تاکہ زندگی کا مقصد متعین ہو، صلاحیتوں کے ظہور کے لئے میدان میسر آسکے، حسن و خوبی کا کوئی قابل تقلید نمونہ مل جائے، علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو پایا تھا اور خدا کے حضور میں مسلمانوں کی بے حسی، جمود، معصیت اور بدحالی کی شکایت کی تھی تو جواب ملا کہ یہ لوگ بغیر کسی مقصد اور پیغام کے زندگی گزار رہے ہیں ان کے سامنے کوئی اسوہ، کوئی نمونہ کامل اور کوئی محبوب نہیں جس کے عشق سے اپنے دلوں کو آباد کریں جس کے حسن و خوبی کے گیت گائیں جس کے نقش قدم کو اپنا نشان راہ بنائیں۔

شبے پیش خدا بگریستم زار   مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم   دلے دارند و محبوبے ندارند

افغانی نوجوانو! خدا نے تمہارے اوپر بڑا فضل فرمایا تمہارے لئے کسی چیز کی کمی نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى   اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا تا آنکہ

يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد — ۱۱) وہ خود اپنے آپ کو بدل ڈالیں۔

اللہ اس سے بہت بلند ہے کہ کسی قوم کو عطا کردہ نعمتیں اس سے چھین لے سوائے اس کے کہ قوم ناشکری کی مرتکب ہو۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ تو نے نہ دیکھا؟ جنہوں نے بدلا کیا اللہ کے
كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو تباہی
(ابراہیم — ۲۸) کے گھر میں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اصل مسئلہ خود شناسی کا ہے، اپنی قدر و قیمت پہچاننے کا ہے، آپ اپنی قدر و قیمت پہچان لیجئے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

* * *

قوموں کی زندگی شخصیت اور پیغام کی رہین منت ہے

www.Ki Sunnat.com

(یہ وہ تقریر ہے جو سعودی سفارتخانہ کے استقبالیہ جلسہ منعقدہ ہوٹل کابل
۵ رجب ۱۹۶۳ء کی شب میں کی گئی)

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ۔

معزز حضرات! آپ کے اس اجتماع اور اس قیمتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے رابطہ عالم اسلامی کی جانب اور اس عزیز و محبوب ملک کا دورہ کرنے والے رابطہ کے وفد کی جانب سے اس پاکیزہ بہترین و منتخب ترین مجمع کو خوش آمدید کہتا ہوں اور یہاں کی حکومت اور عوام کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمارا پرخلوص اور شاندار استقبال کیا، اور ہمارے ساتھ اعزاز و اکرام اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، اور اس میں کوئی ندرت یا حیرت و استعجاب کی بات بھی نہیں کیوں کہ شرافت اور حسن اخلاق ان کا پرانا جوہر ہے، اور عربوں کا بہت پرانا مقولہ ہے "الشئی من معدنہ لا یستغرب" (کوئی چیز اپنے منبع و مخرج میں عجیب

نہیں سمجھی جاتی) اور یہ پاکیزہ روح اپنے وسیع و عمیق مفہوم کے ساتھ اس قوم کے قابلِ فخر کارناموں، اس کی سرفروشی و جانبازی اور اس کی سلطنت و حکومت ہر چیز میں جلوہ گر رہی ہے، اور اسی نے ان کو اپنے ملک کے حدود سے باہر نکلنے، سرِ فلک پہاڑوں کا سینہ چیرنے پر آمادہ کیا، اور یہ اسلام کی مشعل اور تہذیب و ثقافت اور حسنِ انتظام کی صلاحیتیں لئے ہندوستان تک پہنچی، یہی نے اس قوم کی تاریخ میں اس کی عظمت کی داستانوں میں طویل مدت گذاری ہے، افغانستان کے پڑوسی ملک ہندوستان کا شہری ہونے کی وجہ سے ممکن تھا کہ اس سے بہت پہلے میں اس ملک کا دورہ کرتا، لیکن مشیت ایزدی نے اسے تا حال موقوف و موخر رکھا شاید اس میں خدا کی کوئی حکمت و مصلحت پوشیدہ ہو

محترم حاضرین! زمانۂ قدیم میں عرب اس ملک کو بہت دور دراز کا ملک سمجھتے تھے، اسے مسافت کی دوری اور راستوں کی دشوار گذاری کے لئے بطور مثال پیش کرتے تھے اور اس سارے علاقہ کو خراسان کہتے تھے، ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

قالوا خراسان اقصیٰ ما یراد بنا
ثم القفول فقد جئنا خراسانا

(لوگوں نے کہا خراسان ہماری آخری منزل ہے، پھر اس کے بعد واپسی ہوگی، تو یہ لو ہم خراسان پہنچ گئے)

لیجئے ہم لوگ بھی خراسان پہنچ گئے، افغانستان میں داخل ہوگئے، اس کی سرسبز و شاداب سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جسے خدا نے فطری حسن، صحت افزا آب و ہوا، اور دوسری بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

ولما نزلنا منزلاً طلّه الندى   أنيقاً وبستاناً من النور حاليا
أجدّ لنا طيب المكان وحسنه   منًى فتمنّينا فكنتَ الأمانيا

یعنی ہم جب بھی کسی شاداب اور خوب صورت جگہ پہنچے جسے شبنم نے تر کر رکھا ہو اور کلیوں نے آراستہ کر رکھا ہو، اور اس مقام کی دلکشی و رعنائی نے ہماری خوابیدہ تمنائیں بیدار کر دیں ـــــ تو حاصلِ تمنا تم ہی نکلے۔

اس ملک میں داخل ہوتے وقت ہمارا بھی یہی حال تھا، ہم بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے، بات سے بات نکلتی رہی ہے، اور ایک چیز سے دوسری چیزیں یاد آتی جاتی ہیں، چنانچہ اس خطۂ ارض اور خدا کے عطا کردہ اس کے حسن و جمال نے اس ذاتِ والا صفات کی یاد تازہ کر دی، نئی زندگی جس کی رہینِ منت ہے، وہ ذات جس نے ہماری زندگی کی کایا پلٹ دی، پرانی دنیا سے نئی دنیا میں پہنچا دیا، اور ہماری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔

یاد رکھئے! وہ ذاتِ گرامی ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی، آپ سے پہلے ہمارے جسم تھے، روح نہیں تھی، محض نام ہی نام تھا، مگر اس نام کا کوئی مصداق نہیں تھا، صرف صورت تھی، حقیقت نہیں تھی، اور قومیں تھیں، لیکن ان کی زندگی کا کوئی مقصد اور ان کے پاس نوعِ انسانی کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا، اس محبوب و محترم ذات نے ان قوموں اور امتوں کو جدید تشخص و امتیازات سے متصف کیا اور نیا پیغام عطا کیا، وہ مضبوط و محبوب اسلامی تشخص جو طاقت و قوت جوانمردی اور حسنِ اخلاق کے عناصر اور تمام انسانی صفات و کمالات کا جامع ہے، اور پیغام کی بہترین تعبیر و تشریح عرب مسلمانوں کے ایک قاصد نے شہنشاہِ ایران یزدگرد کے دربار میں کی، شہنشاہ نے قاصد سے سوال کیا تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا۔

"اللہ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس کی مرضی کے مطابق انسانوں کو انسانوں کی عبادت سے نکال کر خدائے وحدہ لا شریک لہ کے دربار میں سجدہ ریز کر دیں، اور دوسرے ادیان و ملل کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر اسلام کے عدل و انصاف کی نعمتوں سے ان کا دامن بھر دیں۔"

محترم سفراء اور معزز وزراء!

آپ جن اقوام و ممالک کی نمائندگی کر رہے ہیں، آپ کو ان کا حقیقی اور دیانتدار نمائندہ سمجھتا ہوں، اور میری خواہش ہے کہ آپ اس سے بھی بہتر اور بلند تر ثابت ہوں ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ کی ذمہ داریوں اور آپ کے فرائض کا تقاضا ہے کہ آپ ضابطہ کے کام اور متعین ڈھرے کی کارروائی (ROUTEEN) تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔

مشرق آپ سے کارکردگی کے اس سے وسیع میدان اور اس سے زیادہ اہم کام کا مطالبہ کر رہا ہے۔ آج مشرق کو کتاب زندگی کے حاشیہ پر اور قافلۂ حیات میں سب سے پیچھے جگہ ملی ہے، مغرب احکام صادر کرتا ہے اور یہ اطاعت گزار ہے، وہ کہتا ہے اور یہ سننے پر مجبور، وہ قیادت کرتا ہے اور وہ اس کے پیچھے چلتا ہے، وہ استاذ ہے، اور یہ شاگرد، اس لئے کہ مشرق مغرب کے دسترخوان کی ریزہ چینی پر زندگی گزار رہا ہے، اس کے پاس نہ کوئی شخصیت ہے نہ پیغام، اور قومیں اور تہذیبیں شخصیتوں اور پیغاموں ہی سے زندہ رہتی ہیں، لہٰذا مشرق کے لئے شخصیت اور پیغام تلاش کرنا ضروری ہے، ایسی شخصیت جس میں قوت ہو اعتماد ہو جس کے اندر ثبات و استقامت کا جوہر ہو، جس میں جدت طرازی اور ندرت آفرینی

صلاحیت ہو جس میں خود اعتمادی وخود شناسی ہو، اسی طرح ایسا پیغام جس میں اخلاص، پاکیزگی، لطف ورحمت، عدل ومساوات اور امن پسندی اور اخوت ہو آپ کو دور کی کوڑی لانے اور بال کی کھال نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں پیغام آپ کے سامنے ہے، وہ اسلام کا پیغام ہے جس سے اللہ نے آپ کو سرفراز فرمایا ہے اور جس کا حامل بنایا ہے، آپ کو کسی نئے دین کی ضرورت نہیں بلکہ اس دین پر نئے ایمان کی ضرورت ہے، آپ کو کوئی نیا پیغام درکار نہیں بلکہ اسی پیغام کے لئے جوش اور ولولہ کی ضرورت ہے۔ مسلمان شخص کو قوت پہنچانے اور اسے مزید ترقی دینے کی ضرورت ہے، تاکہ گردش ایام پیچھے پلٹ جائے، اور پرانی تاریخ پھر دہرائی جائے۔

ذوق جمال اور رعنائی خیال

کی

سرزمین (ایران) میں

ترجمہ

نذرالحفیظ ندوی

ایران کی سیر کی دیرینہ آرزو

میری دیرینہ آرزو تھی کہ علم و دانش کے گہوارہ، اور عربی زبان و ادب کے باکمال مصنفین کے مرز بوم، ذوقِ لطیف، فکرِ جمیل، اور حسنِ طبیعت کی نمائندہ سرزمین ایران کی زیارت کروں جس کو بجا طور سے مشرق کے یونان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی آرزو اور خواب میں زندگی گذرتی رہی، اور ایران کے بہارِ بے خزاں کے تصور میں کھویا رہا، جہاں زندگی زندہ دلی کا نام تھا، جہاں کی فضا مترنم، جہاں کی ہر صدا موزوں معلوم ہوتی تھی، جس نے بے چین و بے قرار لیکن سدا بہار فطرت پائی تھی، جس کا اظہار انوکھے خیالات، جدت پسند مذاہب اور فلسفوں میں ہوتا رہا، اور جہاں وہ تصوف بھی خوب پھلا پھولا جو معرفت و محبت سے مخمور اور نئے نئے واردات و تجربات سے معمور تھا۔

لیکن یہ امید اخیر زمانہ میں بر آئی جبکہ قافلۂ عمر سفر کی بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا، اور حسین و جمیل افکار و خیالات سے لطف اندوزی پر حقیقت کی تلاش غالب آ چکی تھی، اور شاید یہ اچھا ہی ہوا۔

سفر کی تقریب

رابطہ عالم اسلامی نے عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کا جائزہ لینے کا ایک جامع پروگرام بنایا تھا۔ اس پروگرام سے افغانستان و ایران کو دیکھنے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو سکی۔ رابطہ عالم اسلامی کے وفد نے ایران کی علمی و ادبی شخصیات، انجمنوں، علمی اداروں اور تاریخی آثار دیکھے، اور ایران کے سفر کو کارآمد اور زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں ہر ممکن کوشش کی۔

ایرانی وزارت اوقاف کے صدر اور نائب وزیر اعظم ڈاکٹر منوچہر ازمون نے پوری گرم جوشی سے رابطہ کے وفد کی پذیرائی کی، اور اس کے دورۂ ایران کی پوری ذمہ داری وزارت اوقاف کے سپرد کر دی۔ رابطہ کا وفد ڈاکٹر ازمون کی عنایت و توجہ اور ان کے جذبہ کی قدر کرتا ہے، اور ایران کی روایتی فیاضی و مہمان نوازی کا اعتراف اپنا فرض سمجھتا ہے۔[1]

قیام ایران کی مدت

ہمارے وفد کو آٹھ دن کے اندر ایران کے تاریخی آثار دیکھنا، اسلامی تحریکوں اور ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا تھا، لیکن جس کی گھٹی میں فارسی زبان و ادب کا ذوق پڑا تھا، ڈاکٹر ازمون سے عرض کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ایران آنا اور شیخ سعدیؒ اور خواجہ حافظؒ کا شہر شیراز نہ دیکھنا بڑی محرومی و بدمذاقی ہے، اس لئے کہ شیخ سعدیؒ اور خواجہ حافظؒ اور ان کی

---

[1] وفد کی رہنمائی و رفاقت کے لئے وزارت اوقاف تہران کے سکریٹری ڈاکٹر ابوالقاسم مشیری کا انتخاب کیا گیا تھا، جو ایک تعلیم یافتہ مستعد آدمی ہیں، انگریزی روانی سے بولتے ہیں، عربی سے بھی خاصے واقف ہیں۔

لافانی کتابوں سے ہندوستان کے شرفاء کے گھرانے نصف صدی پہلے تک واقف اور دونوں کے ساحرانہ کلام سے آشنا ہوا کرتے تھے، ڈاکٹر آزمون نے ہماری یہ درخواست بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرلی، اور ازراہِ کرم شعر و ادب کے شہر شیراز کے ساتھ ہی شاہانِ صفویہ کے دارالحکومت اور ایرانی فن کاری اور تاریخی آثار سے معمور اصفہان کو بھی اس میں شامل کر دیا، اس طرح ایران کا یہ دلچسپ اور یادگار سفر (جس کی ابتداء دوشنبہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۷۳ء[1] سے ہوئی تھی) بخیر و خوبی چہار شنبہ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۰ جون ۱۹۷۳ء کو ختم ہو گیا چونکہ اس سفر کی آخری منزل لبنان تھی، اس لئے ہم تہران سے بیروت ۲۱ جون کو پہونچ گئے۔

ہمارے قیام کا انتظام تہران کے ایک بڑے ہوٹل پارک ہوٹل (PARK HOTEL) میں کیا گیا تھا، ایران کے یادگار سفر کے یہ دلچسپ روز تاریخی آثار کے مشاہدے، ممتاز علمی و دینی شخصیات سے ملاقاتوں، تعلیمی اور تبلیغی اداروں کا جائزہ لینے، اور ان کی سرگرمیوں اور جدوجہد سے واقف ہونے اور استقبالیہ وغیرہ منعقدہ تقریبات میں گذرے۔

وزراء و علماء سے ملاقاتیں

ہماری ملاقات ایران کی بعض اہم سیاسی شخصیتوں سے بھی ہوئی، جن میں ایرانی وزیر اعظم امیر عباس ہویدا[2]، دانا کاظم زادہ جو ایران میں ایجوکیشن کے منسٹر ہیں اور نائب وزیر اعظم ڈاکٹر منوچہر آزمون قابل ذکر ہیں، آخر الذکر سے تہران کے دوران قیام میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں،

---

[1] ایرانی تقویم کے اعتبار سے ۲۱ خرداد ۱۳۵۲ھ ش۔

[2] امیر عباس ہویدا نے ابتدائی تعلیمی زمانہ بیروت میں گذارا، جہاں انھوں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے ڈگری لی، اسی بنا پر عربی اپنی زبان کی طرح بولتے ہیں، تقریباً آٹھ سال سے وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہیں۔

پہلی ملاقات خاصی طویل رہی جس میں بے تکلفی و آزادی کے ساتھ گفتگو میں مختلف علمی و دینی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ آخری ملاقات میں بھی یہی بے تکلفی و سادگی رہی اور مفید علمی مذاکرہ سے یہ مجلس بھی خالی نہ گئی۔ اختتام سفر پر ڈاکٹر منوچہر ازمون نے ہلٹن ہوٹل (HILTON HOTEL) میں وفد کے اعزاز میں ایک پرتکلف عشائیہ دیا جس میں متعدد وزراء کے علاوہ شہر کے شرفاء اور معززین کی بڑی تعداد شریک تھی۔

ہم نے ایران کے متعدد ممتاز علماء اور دینی رہنماؤں سے بھی ملاقات کی اور ان سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ ان قابل ذکر علماء میں آیت اللہ العظمیٰ[1] سید محمد کاظم شریعت مداری، آیت اللہ العظمیٰ شیخ حبیب اللہ میلانی، آیت اللہ مرزا محمد خلیل کمرہ ای، تہران میں شاہی مسجد کے امام آیت اللہ سید حسن امامی اور مشہور ایرانی عالم آیت اللہ محمد تقی آملی شامل ہیں۔ ایرانی فضلاء و ادباء میں سے علامہ وحیدی[2] اور کلیۃ الالٰہیات کے پرنسپل ڈاکٹر محمد محمدی قابل ذکر ہیں۔ کلیۃ الالٰہیات میں فقہ شافعی کے استاد پروفیسر شیخ الاسلام مصری، ماہنامہ الفکر الاسلامی تہران کے مدیر ڈاکٹر عباس مہاجرانی، آریہ مہر یونیورسٹی تہران کے وائس چانسلر اور شہرۂ آفاق ایرانی فاضل و محقق ڈاکٹر سید حسین نصر اور ادارہ التبلیغ الاسلامی قم کے سرگرم رکن اور "الہادی" رسالہ کے مدیر سید ہادی خسرو شاہی سے ملاقات ہوئی۔ وقت کی تنگی نیز موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے ایرانی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ممتاز جدید تعلیم یافتہ فضلاء سے زیادہ ملاقات نہ ہو سکی۔

---

[1] ایرانی علماء و فضلاء کے دو طبقے ہیں۔ تبحر علمی اور دینی حیثیت میں بلند منصب و مقام کے حامل علماء کو آیت اللہ العظمیٰ اور دوسرے درجے کے علماء کو آیت اللہ سے موسوم کرتے ہیں۔

[2] ناظم مسجد سپہ سالار تہران۔

ایران کے دینی و تاریخی مقامات

ہمیں ایران کے جن مشہور تاریخی شہروں کے دیکھنے کا موقع ملا، ان میں تہران، قم، اصفہان، شیراز اور مشہد قابل ذکر ہیں۔ تہران[1] ایران کا بڑا خوبصورت شہر اور پایۂ تخت ہے۔ قم بڑا علمی و دینی مرکز ہونے کے لئے مشہور ہے۔ مشہد روحانی مرکز اور اصفہان شاہانِ صفویہ کا طویل مدت تک مرکزِ سلطنت اور اپنے دورِ عروج میں تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہ چکا ہے اور شیراز تو فارسی شعر و ادب کے لئے ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ کے ایک مسلمان طالب علم، قدیم آثار سے شغف رکھنے والے مورخ اور ملکوں ملکوں شہروں شہروں گھومنے اور ان کے حالات کا مطالعہ کرنے والے سیاح کے لئے ایران کے تاریخی مقامات میں تسکین کا پورا سامان موجود ہے۔ چنانچہ ہم نے ان تمام تاریخی آثار کا مشاہدہ کیا جو دستکاری، صناعی، پاکیزہ ذوق اور فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں، اور شاہان صفویہ کے دورِ عروج کے تمدن اور ترقی یافتہ تہذیب کے نادر شاہکار ہیں۔ ہم نے ایران کی جدید مصنوعات اور ان چیزوں کو بھی دیکھا جو سوغات کے طور پر باہر لے جائی جاتی ہیں، اور جن میں ایران نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔

ایران چونکہ اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے، اس لئے وہاں کثرت سے

---

[1] موجودہ تہران ایران کے قدیم اسلامی دار السلطنت "رے" کے نواح میں واقع ہے جہاں سے امام فخر الدین رازی، ابو عمر رازی، محمد ابن زکریا رازی، ابو بکر رازی جیسے نادرِ روزگار فضلا اٹھے۔ تہران کی حیثیت پہلے ایک قصبہ سے زیادہ نہ تھی۔ قاچاریوں کے عہد میں وہ ایران کا دارالحکومت بنا۔ اب ستر لاکھ کی آبادی کا ایک عظیم شہر ہے، جو تمام منصوبہ اور نقشہ کے مطابق آباد کیا گیا۔

مساجد ہیں۔ بعض مسجدیں تو فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ مثلاً امام علی رضا ابن موسیٰ کاظم کی بہن سیدہ معصومہ کے نام سے ایک شاندار مسجد ہے جہاں ان کی قبر بھی ہے، یہ مسجد ایرانی زائرین اور سیاحوں سے ہر وقت کھچا کھچ بھری رہتی ہے، دوسری تاریخی مسجد "مسجد سپہ سالار" ہے جو طرز تعمیر اور نقش و نگار میں شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ ان مسجدوں کے علاوہ شاہی مسجد تہران، جامع مسجد، مسجد گوہر (مشہد) مسجد شاہ عباس صفوی، مسجد شیخ لطف اللہ، جامع مسجد چہار باغ (اصفہان)، اور شیراز کی "مسجد وکیل" قابل ذکر ہے۔ امام علی رضا کا مزار پورے ایران میں سب سے اہم اور بڑے مقبروں میں سے ہے جس کی زیارت کے لئے ایرانی زائرین دور دور سے رخت سفر باندھ کر آتے ہیں، اور ملک کے ہر حصہ سے ان کا دن رات تانتا بندھا رہتا ہے۔

ایران میں بعض اہم علمی اداروں اور دینی مرکزوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، ان اداروں میں تہران یونیورسٹی کا "کلیۃ الالٰہیات والعلوم اسلامیہ" "مرکز التقریب بین المذاہب الاسلامیۃ" اور شہر قم کا علمی مرکز "دار التبلیغ الاسلامی" مشہور و معروف ہیں۔

مجالس مذاکرہ اور استقبالیہ جلسے

اس دس روزہ سفر میں بہت سے خیر مقدمی جلسوں اور تقریبات میں شرکت کا موقع ملا جہاں رابطہ کے وفد کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ ان جلسوں میں خیر مقدمی تقریریں کی گئیں، اور ارکان وفد نے بھی موقع و محل کی مناسبت سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا، اس سلسلہ کے چار خیر مقدمی جلسے یادگار رہیں، پہلا خیر مقدمی جلسہ علامہ شریعت مداری کے دولت کدہ پر منعقد ہوا، دوسری محفل "دار التبلیغ الاسلامی" قم میں منعقد کی گئی تھی جس میں

متعدد تقریریں ہوئیں، اور قصائد پڑھے گئے۔ تیسرا استقبالیہ علامہ مرزا محمد خلیل کمرہ ای نے وفد کے اعزاز میں اپنے گھر پر دیا تھا۔ وفد کے اعزاز میں علامہ حبیب اللہ میلانی کے دولت کدہ پر بھی ایک مختصر تقریب ہوئی۔ دار التبلیغ الاسلامی اور علامہ حبیب اللہ میلانی کے یہاں کی محفلوں میں خیر مقدمی اور جوابی تقریریں ہوئیں لیکن مرزا محمد خلیل کا جلسہ اس اعتبار سے دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ اس محفل میں علامہ اقبال کا شہرۂ آفاق ترانہ ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا

پڑھا گیا۔ یہ ترانہ عربی کے قادر الکلام شاعر صاوی شعلان نے عربی اشعار کی صورت میں ڈھال دیا ہے چنانچہ اس عربی ترانہ کو پڑھا گیا اور اس کا فارسی اشعار میں ترجمہ بھی سنایا گیا۔ خیر مقدمی تقریر کا جواب رکن وفد استاذ احمد محمد جمالی اور راقم سطور نے دیا۔

تہران میں ایک ادارہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اسلامی مسالک و فرقوں کے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ ہم اس ادارہ کو بھی دیکھنے گئے۔ وہاں شہر کے بعض منتخب علماء اور سربرآوردہ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اس ادارہ کے خیر مقدمی جلسہ میں آیت اللہ محمد تقی القمی نے تقریر کی جس کا جواب راقم سطور نے دیا۔

طوس کی مردم خیز سرزمین پر

ایران کی عظمت رفتہ کو ثانی بنانے اور فارسی زبان و ادب کو زندگی و تابندگی عطا کرنے اور قومی شعور کی بیداری میں شہرۂ آفاق شاعر فردوسی (م ۴۱۱ھ) کے شاہنامہ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ہر زمانہ میں ایرانی شاہنامہ کے وارفتہ و شیدائی رہے۔ ایرانی حکومت نے فردوسی کی شاندار یادگار قائم کر کے اس کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ایران کا مشہور شہر طوس[1] اپنی مردم خیزی، باکمال ہستیوں اور لافانی یادگاروں کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس شہر نے پانچویں صدی ہجری کے نامور مجدد حجۃ الاسلام امام غزالی، سلجوقی سلطنت کے باکمال وزیر نظام الملک طوسی، شہرۂ آفاق شاعر فردوسی، اور مشہور فاضل نصیر الدین طوسی جیسی نادرۂ روزگار شخصیتوں کو پیدا کیا۔

امام غزالی کی تربت پر

طوس کی فضا میں سانس لیتے ہی پردۂ ذہن پر تاریخ کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں اور اس عہد کے ترقی یافتہ اور متمدن زمانہ کی تصویریں متحرک نظر آنے لگتی ہیں، میں اس عہد کے تصور میں کھو گیا، جب طوس علم و عرفان کا سرچشمہ تھا، اور وہاں سے پوری پوری نسل تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو کر کارزار حیات میں سرگرم عمل ہوتی تھی۔ طوس کے تاریخی آثار دیکھتے ہوئے قدرتاً ہمارا ذہن صدیوں اور نسلوں پر محیط امام غزالی کے کارناموں کی طرف منتقل ہو گیا، اس لئے کہ امام غزالی کی شخصیت، ان کے لافانی کارناموں، اور ان کی تصنیفات کو جو شہرت اور دوام نصیب ہوا ہے، وہ عالم اسلام کے مشہور مذاہب اربعہ کے بانیوں کے بعد کم ہی علما کو حاصل ہوا ہے۔ ہم نے جب اپنے رہنما سے امام غزالی کی قیام گاہ، ان کے علمی آثار اور آخری آرام گاہ کے بارے میں دریافت کیا، تو جواب کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

---

[1] مشہور مورخ بغدادی نے طوس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "مراصد الاطلاع" میں لکھا ہے کہ نیشاپور سے طوس کا فاصلہ دس فرسخ ہے (تقریباً اسی کیلومیٹر ہے) "طابران" اور "نوقان" طوس کے دو مشہور قصبے ہیں۔ ان دونوں قصبوں میں نوقان میں ایک مزار بستان ہے جہاں عباسی خلیفہ ہارون رشید اور امام علی بن موسیٰ رضا کی قبریں بھی ایک باغ میں ہیں۔

ہمارے رہنما نے ہمیں مختلف کھنڈروں کے ملبہ اور ویرانوں کے درمیان سے لے جا کر ایک ایسی قدیم عمارت کے سامنے کھڑا کر دیا جو زمانہ کی ناقدری اور بے مروتی پر نوحہ خواں تھی، ہم جس عمارت کے سامنے کھڑے تھے اس کے متعلق بتایا گیا کہ اس میں ہارون رشید اپنے معتوبین کو قید کر دیا کرتا تھا، قیدی اس میں جانے کے بعد پھر سورج کی روشنی نہیں دیکھ سکتا تھا، اس عمارت کا نام ہارونیہ ہے۔

امام غزالی کی قبر کے متعلق طرح طرح کی بے سروپا کہانیاں مشہور ہیں، تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر حلبی حدیثی کی کتاب "آرامگاہ غزالی" میرے ہاتھ آگئی، انھوں نے ان افواہوں کا مذاق اڑایا ہے، اور یورپین محققوں میں ڈاکٹر زویمر (DR. ZWEMER) امریکی مستشرقین میں پروفیسر پوپ (PROF. POPE) کی کتابوں کے حوالے، اور متقدمین میں مشہور مصنف تاج الدین سبکی، اور متاخرین میں آقائے علی اصغر حکمت کی تحقیقات سے استدلال کرکے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ امام غزالی کی قبر اسی قدیم افسانوی عمارت ہارونیہ کے پہلو میں موجود ہے

ہمارا تاریخی ذوق اور امام غزالی اور ان کی تصنیفات سے دلچسپی و شیفتگی ہمیں کشاں کشاں ان کی قبر تک لے گئی، اندازہ ہوا کہ ابھی حال ہی میں ایک قبر کو درست کیا گیا ہے، ہم جس عمارت میں تھے اس کے پہلو میں امام غزالی کی قبر ہے، لیکن مزار پر کوئی تختی نہ تھی جس سے کچھ معلوم ہو سکتا، گائیڈ نے بتایا کہ عمارت کے اندر ایک کتبہ موجود ہے، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بعض الفاظ مٹ گئے ہیں، بمشکل چند الفاظ پڑھے جا سکے، اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی اور عظمت و کبریائی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، سچ ہے: "اللہ بس باقی ہوس" "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ"

نادر شاہ افشار

طوس کے دوسرے اہم تاریخی آثار میں نادر شاہ افشار کی قبر ہے۔ نادر شاہ افشار سے کون واقف نہیں اس نے ۱۷۳۹ء بمطابق ۱۱۵۲ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اور دارالحکومت دہلی کو اپنی تلوار کی دھار پر رکھ لیا تھا۔ یہ تلوار نیام میں اسی وقت گئی جبکہ دہلی کی سڑکیں خون سے نہا گئیں[1] نادر شاہ مغل بادشاہ محمد شاہ کو شکست دے کر ہندوستان سے وہ شہرۂ آفاق تخت طاؤس ایران لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو شاہجہاں نے نفیس ہیرے جواہرات سے مرصع بنوایا تھا۔

نادر شاہ کا شمار اس عہد کے ایران کے بہترین قائدین اور اعلیٰ درجہ کے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا۔ اس نے مشہد کو اپنا دارالحکومت۔ اور ہندوستان پر یورش کے لئے فوجی مرکز بنایا تھا۔ ایرانی حکومت نے کاخ گلستان میں نادر شاہ کے آثار و نوادر کو بڑے قرینہ اور سلیقہ سے ایک میوزیم میں جمع کر دیا ہے۔ اور تصاویر کے ذریعہ اس کے فوجی کارناموں اور عزم و شجاعت کی داستانوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ نادر شاہ کا لایا ہوا تخت طاؤس تو اب اصل شکل میں ...محفوظ نہیں ہے لیکن تہران کے میوزیم میں ایرانی حکومت نے تقریباً ویسا ہی تخت

---

[1] دہلی کے اس قتل عام کی وجہ یہ تھی کہ نادر شاہ کی فوج شہر کے مختلف مقامات پر مقیم تھی۔ شہر کے اوباشوں کو جب یہ موقع ملا وہ نادر شاہ کی فوجوں پر حملہ کر کے ال و اسباب لوٹ لیتے اور فوجیوں کو قتل کر ڈالتے۔ نادر شاہ نے تنگ آ کر فوج کو قتل عام کا حکم دے دیا چنانچہ تین دن تک قتل عام ہوتا رہا۔ اس قتل عام میں ایک لاکھ سے زائد انسان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تین دن کے بعد امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔

ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان"

بنانے کی کوشش کی ہے۔ اصل ہیرے جواہرات کو بینک کے لاکروں اور میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

خلیفہ ہارون رشید کی یاد

مسلم حکمرانوں، بلکہ مشرق کے سلاطین میں عباسی خلیفہ ہارون رشید کو جیسی افسانوی شہرت اور جتنی غیر معمولی وسیع سلطنت حاصل تھی، وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس کی سلطنت کی غیر معمولی وسعت کا اندازہ اس کے اس مشہور تاریخی جملے سے ہوتا ہے جو اس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو مخاطب کر کے کہا تھا: "امطری حیث شئت فسیأتینی خراجک" (اے بادل تیری جہاں مرضی ہو برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئیگا) تاریخی اعتبار سے یہ تو ثابت ہے کہ ہارون رشید کی قبر طوس میں ہے لیکن حیرت و تعجب بلکہ عبرت انگیز بات یہ ہے کہ ہارون رشید[1] کی قبر کا نام و نشان تک نہیں مل سکا، یہ ممکن ہے کہ اس کی قبر امام علی رضا

---

[1] ہارون رشید کی وفات ۱۹۳ھ میں طوس میں ہوئی۔ اور وہیں اس کی تدفین بھی عمل میں آئی۔ اس کے چند سال بعد ۲۰۳ھ میں طوس ہی میں امام علی رضا کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔ ابن خلکان نے امام علی رضا کا تذکرہ کرتے ہوئے "وفیات الاعیان" میں لکھا ہے کہ ان کے جنازہ کی نماز مامون رشید نے پڑھائی اور جنازے کے بعد ان کی تدفین اپنے والد کی قبر کے پہلو میں کی۔ امام علی رضا کی وفات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی موت طبعی تھی لیکن بعض لوگ ان کی موت کا سبب زہر خورانی کو قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چونکہ مامون نے خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کرنی چاہی تھی، اس لئے بنو عباس نے انہیں زہر دے دیا۔ طوس امام علی رضا کے مزار کی وجہ سے مشہد کے نام سے مشہور ہو گیا اور اب طوس کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ یہ تبدیلی غالباً شاہان صفویہ کے زمانہ میں پیش آئی۔ اس زمانہ میں یہ پورا منطقہ خراسان کہلاتا تھا۔ آج بھی یہ علاقہ خراسان ہی کے نام سے مشہور ہے۔

کے مزار کے پہلو میں ہو، لیکن مؤخر الذکر کی دینی اہمیت و عظمت کے سامنے ایک بادشاہ کی حیثیت بے حقیقت ہو کر رہ گئی ہے۔[1]

اصفہان

ایران کے اس سفر میں مشہور تاریخی شہر اصفہان کو بھی دیکھا جو اپنے علما، ادبا اور باکمال شخصیتوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہے۔ مشہور کتاب "حلیۃ الاولیاء" کے مصنف ابو نعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ)، "مفردات غریب القرآن" کے مؤلف امام راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ)، عالمی شہرت کی حامل کتاب "روایات الاغانی" کے مصنف ابو الفرج الاصبہانی (م ۳۵۶ھ)، مستقل فقہی مسلک کے بانی امام ابو داؤد ظاہری (م ۲۷۰ھ)، مشہور متکلم اور اصولی ابوبکر محمد بن فورک (م ۴۰۶ھ) محتاج تعارف نہیں۔

اسلامی تاریخ کے آغاز خصوصاً عباسی عہد میں اصفہان علم و تہذیب و تمدن کا مرکز بن چکا تھا، لیکن صفویوں کے عہد میں اس کو بڑی غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی اور ایران کے شہروں میں تو اس کا شمار صف اول کے شہروں میں ہونے لگا۔ صفوی خاندان کے حکمران اور بانی شاہ اسماعیل صفوی کی تاج پوشی و تخت نشینی تبریز میں ہوئی تھی۔ اس بادشاہ نے سب سے پہلے شیعی مذہب کا اعلان کیا اور اس کو حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا اور قزوین کو دارالحکومت بنایا۔ شاہ اسماعیل صفوی کے جانشین شاہ عباس صفوی کی

---

[1] مشہد سے کچھ فاصلہ پر نیشاپور کا قدیم شہر واقع ہے جہاں کی خاک سے خواجہ فرید الدین عطار جیسے عارف اور عمر خیام جیسے شاعر اٹھے۔ افسوس ہے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے ہم اس کی زیارت نہ کر سکے۔

(م ۱۰۳۸ھ) ہوئے جو صفوی سلاطین میں سب سے زیادہ نامور اور عظیم حکمراں گذرا ہے اس کے عہد میں قزوین سے دارالحکومت اصفہان منتقل کیا گیا۔ اصفہان کی جدید تعمیرات، شاندار تمدن اور غیر معمولی حسن و جمال شاہ عباس صفوی کا رہین منت ہے۔ اصفہان کی پرشکوہ اور نادر روزگار عمارتوں کو دیکھ کر شاہ عباس صفوی کے صاف ستھرے تعمیری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصفہان میں ہمارا قیام شاہ عباس صفوی سے منسوب ایسے ہوٹل میں رہا جس کا نام "مہمان سرائے شاہ عباس صفوی" ہے۔ جس پر کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس سے بڑھ کر کسی شاہی محل کا دھوکا ہوتا ہے۔ شہر میں ہر طرف جابجا تاریخی آثار، باغ، اور مزارات ہیں، جن کے سب کے دیکھنے کی نوبت نہ آسکی۔

صفویوں نے تقریباً دو صدی تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ لیکن دنیا کے ہر حکمراں خاندان کی طرح صفوی خاندان بھی زوال و انحطاط سے بچ نہ سکا۔ انتشار اور بے چینی کے دور کا آغاز ہو گیا۔ انتشار کے دور میں بھی کوئی مختصر وقفہ ایسا بھی آجاتا تھا جب کوئی طاقت ور اور مستحکم قیادت منتشر اور پراگندہ حالات ایران کو سنبھالا دے جاتی تھی لیکن جلد ہی ترک النسل قاچاریوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ آغا محمد شاہ (م ۱۲۱۱ھ) کے عہد میں اصفہان سے دارالحکومت تہران منتقل ہو گیا جس کی اس زمانہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں تہران کے تمدن اور رونق میں اضافہ ہو گیا۔

[illegible]

شیراز

ہندوستانی ادبیات و دانشوروں اور شعر و شاعری کے ساتھ شیراز کا نام ہر عہد

01827

شیر و شکر ہو گیا ہے کہ اس کا الگ کرنا مشکل ہے۔ سعدیؔ کی شیریں کلامی اور حافظؔ کی خوشنوائی نے شیراز آنے سے پہلے شیراز کا مشتاق و گرویدہ بنا رکھا تھا۔ فارسی کے شاعر نے صحیح کہا ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اسی شیراز میں حکمت و دانائی اور محبت و معرفت کے سب سے بڑے ترجمان شیخ سعدی (م ۶۹۱ھ) اور خواجہ حافظ (م ۷۹۱ھ) آسودۂ خاک ہیں۔ ان میں شیخ سعدیؒ اپنی شہرۂ آفاق کتابوں گلستان و بوستان کی وجہ سے بقائے دوام کے خلعت سے سرفراز ہیں۔ شیخ کے مدفن کو سعدیہ کہا جاتا ہے۔ شیخ سعدی کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے مجھے ان کے مشہور دو شعر یاد آ گئے ؎

غرض نقشے است کز ما باز ماند　　کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت　　کند بر حال ایں مسکین دعائے

دوسری شخصیت خواجہ حافظ شیرازی کی ہے جو اپنی عارفانہ و عاشقانہ شاعری کی وجہ سے "ترجمان الغیب" اور سروش غیب بن گئے ہیں اور جن کی شاعری "ورائے شاعری چیزے دگر است" کی مصداق ہے۔ ان کا یہ شعر خوبان کے حسب حال ہے ؎

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
با حریفاں ہرچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

ان کے مدفن کو حافظیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جدید شیراز کی آبادی اور رونق اور مساجد کی تعمیر میں زند خاندان کے حکمراں

کریم خاں کا بڑا حصہ ہے۔ زند خاندان نے صفویوں کے بعد ایران پر حکومت کی تھی، اور شیراز کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔

شیراز اپنی مردم خیزی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس خاک سے ایسی باکمال شخصیتیں اٹھیں جو اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھیں۔ ان شخصیتوں میں جامع نظامیہ بغداد کے صدر مدرس علامہ ابو اسحاق شیرازی (م ۴۷۶ھ) امام محمد علی ابن عطیہ ابو الحسن الدیلمی (م [illegible]) قابل ذکر ہیں۔ آخر زمانہ میں تو اس کی خاک سے علامہ صدر الدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ) کی شخصیت پیدا ہوئی جن کی دو کتابیں "اسفار اربعہ" "شرح ہدایت الحکمت معروف بہ صدرا[1]" عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ دوسری شخصیت امیر فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ) کی ہے، جن کے گہرے اثرات ہندوستان کے نصاب درس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تیسری مشہور شخصیت امیر غیاث الدین منصور کی ہے۔

ایران کی سب سے قدیم اور تاریخی یادگار تخت جمشید کو بھی دیکھا۔ تخت جمشید کو دارا اول نے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ آج اس کے کھنڈر ڈھائی ہزار سال بعد رہ گئے ہیں، وہ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، ان کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کی حیرت انگیز انجینئرنگ اور تعمیری نادر و شاہکار نمونوں کو دیکھ کر تصویر حیرت بن جاتا ہے۔ تخت جمشید اپنی غیر معمولی بلندی، بھاری بھرکم پتھروں کو اوپر لے جا کر سلیقہ و صفائی اور خوبی سے جوڑنے اور ان کی غیر معمولی مہارت و صلاحیت کو دیکھ کر بے اختیار اہرام مصر یاد آجاتے ہیں، اور تعمیری ذوق کی داد دینے پر بیساختہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ایران کی

---

[1] ہندوستان کے نصاب درس میں صدرا گیارہویں صدی ہجری سے داخل نصاب ہے، اس کے حصول اور اس میں مہارت کے بغیر طالب علم فارغ التحصیل اور فاضل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

حکومت نے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں یہاں ڈھائی ہزار سالہ جشن بڑے تزک و احتشام سے منایا تھا اس جشن میں تمام دنیا کے سربراہان مملکت، وزرائے اعظم اور سفارتی نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس جشن پر جو غیر معمولی اخراجات ہوئے تھے اس کی تفصیلات سن کر الف لیلوی داستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔ تخت جمشید شیراز سے صرف ساٹھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔

ان تاریخی آثار اور عمارتوں کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ آخر صحرائے عرب کے گلہ بان اور خانہ بدوش کیسے اس متمدن، ترقی یافتہ اور علم و دانش سے معمور سرزمین کو زیر نگین کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے خمیر میں قیادت و سیادت تھی، اور جو نسل در نسل ہزاروں سال سے حکومت کرتی آ رہی تھی۔ دل نے یہی جواب دیا کہ یہ سب ایمان کی طاقت کی کارفرمائی اور اسلامی تعلیمات کا فیض ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب کے یہ شتربان تمدن کے مفاسد اور عیش و تنعم کی زندگی سے کوسوں دور تھے۔

شیراز میں ہمارا قیام "سائرس ہوٹل" میں رہا۔ سائرس بڑے نامور ایرانی شہنشاہوں میں گزرا ہے۔ اس کو ایران کی عظمت رفتہ کا نشان، اور ایرانی شان و شوکت کا رمز تصور کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے سورہ کہف میں ذوالقرنین[1] کے نام سے جس شخص کا تذکرہ کیا ہے بعض محققین کے نزدیک اس سے مراد سائرس اعظم ہے۔ یہودی سائرس اعظم کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ اسی نے بخت نصر کے چنگل سے یہودیوں کو نجات دلا کر فلسطین میں انہیں واپس کیا تھا۔ اسی سائرس اعظم کی یاد میں ایرانی حکومت نے ڈھائی ہزار سالہ جشن بڑے

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "تفہیم القرآن" میں اسی قول کو ترجیح دی ہے لیکن جدید تاریخی تحقیقات کی روشنی میں بعض اہل علم کو اس میں کلام ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

تزک و احتشام سے سجایا ہے، سارس ہوٹل کا شمار ایران کے ان بڑے ہوٹلوں میں ہوتا ہے جہاں ہوٹل کی تزئین و آرائش، اس کے ملازمین کے لباس اور وضع قطع، اور کھانوں میں بھی قدیم ایرانی تہذیب و معاشرت کے مظاہر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ شہر کے دوسرے ہوٹلوں میں بھی اسی وضع قطع کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا سرائے مشیر میں کھایا جو شیراز کے قدیم تمدن کی عکاسی کرتا ہے، ملازمین کا لباس وہی ہے جو صفویوں کے عہد یا قدیم ایران میں شاہی خادموں کا ہوا کرتا تھا۔

شیراز کے رہنے والے فطرتاً خوش طبع، اور نغمہ و سرود کے شیدائی ہیں۔ شب کو جب پورا شہر نغمہ و موسیقی، اور رنگ و نور کے سیلاب میں بہہ رہا تھا، میں ہوٹل کی بالکنی پر بیٹھا یادوں کے سمندر میں غرق، ماضی کی تاریخ، اور زمانہ کے واقعات و انقلابات میں ایسا محو تھا، جیسے میری نگاہوں کے سامنے کسی ڈرامہ کے مختلف مناظر ہوں جن کے کردار اور مناظر بار بار تبدیل ہو رہے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت میری زبان پر بار بار آ رہی تھی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ	اور دنیا کی زندگی بجز لہو و لعب کے اور
وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ	کچھ بھی نہیں، اور اصل زندگی عالم آخرت ہے
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت ـ ۶۴)	اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا	کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں جس میں دیکھتے
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	بھالتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا
كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ	انجام کیا ہوا، وہ ان سے قوت میں بھی بڑھے
وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ	ہوئے تھے، اور انھوں نے زمین کو بھی بویا جوتا
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ	تھا اور جتنا انھوں نے اس کو آباد کر رکھا ہے

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ۝

(الروم — ۹)

اس سے زیادہ انھوں نے اس کو آباد کیا تھا، اور
ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لیکر آئے
تھے، سو خدا ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ
تو خود اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

ایران کا یہ سفر اپنی نوعیت اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا، ایران کی مجلسوں اور محفلوں میں اس کا خوب چرچا ہوا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ بھی اس کی اشاعت ہوئی، سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والے اس جائزہ سے سفر کی ایک اجمالی تصویر اپنے ذہن میں تیار کر سکتے ہیں، اور اس سفر کی تاریخی قدر و قیمت اور علمی و سماجی فوائد کا ایک عام اندازہ کر سکتے ہیں۔

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

سفر کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے چند نقوش و تاثرات بھی پیش کئے جائیں، اس لئے کہ اس سفر کی قدر و قیمت محض یہ نہیں ہے کہ یہ مشرق کے ایک اسلامی ملک کی سیاحت اور خیرسگالی کا دورہ تھا، بلکہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے یہ سفر تمام تاریخی سفر ناموں، اور آثار قدیمہ کی زیارت اور جذبہ خیرسگالی سے زیادہ نتیجہ خیز تھا، ہم اس موقعہ پر اس سفر کے ان خوشگوار اور تابناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جن سے ہمیں کام کا ایک نیا میدان، اور امید کی ایک نئی کرن دکھائی دیتی ہے، اور جو مستقبل کے لئے فال نیک بن سکتے ہیں، ہم ایسے پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کریں گے، جو باعث حیرت ضرور ہوں گے، مگر اس کے لئے تھوڑی سی وسیع النظری، اور کشادہ دلی سے کام لینا ہوگا، ساتھ ہی

کہنے والے کے خلوص و حسن نیت پر بھی اعتماد کرنا پڑے گا۔ ہمارے ایرانی بھائی عالی ظرف اور شریف النفس ہیں۔ اس لئے توقع ہے کہ ایران کے دوران قیام میں ہم نے جو محسوس کیا، اور ہمارے جو تاثرات ہیں، ان کے اظہار میں وہ ہماری جرأت و صاف گوئی کا خیر مقدم کریں گے۔

۱- ایران کے سفر میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا، اور اس نے ہماری مسرت میں اضافہ کیا، وہ ایرانیوں کا جذبۂ اخوت اور عالمگیر اسلامی اتحاد و تعاون کا جذبہ ہے۔ اگر وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صفائی سے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم آنے سے پہلے اتحاد و تعاون کے اس جذبہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ دوستی و اتحاد اور بھائی چارہ اور اپنائیت کے اس احساس کا تصور نہیں کرتے تھے۔ ہمیں اس بات کی توقع نہ تھی کہ ہمارے ایرانی بھائی اس عالمگیر لادینیت کے خلاف متحد ہو کر صف آرائی کی خواہش رکھتے ہیں جو مذہب عالم اور تمام اخلاقی اقدار کے لئے چیلنج ہے، اور جو شیعہ، سنی، حنفی، شافعی، اور مقلد و مجتہد کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتی۔ ایران میں ہر مجلس کی گفتگو کا آغاز اکثر اسی موضوع سے ہوتا اور اسی پر اختتام بھی۔ مجلسوں اور محفلوں میں عام طور سے یہی موضوع سخن ہوتا۔ بلاشبہ یہ بہت مبارک اور قابل قدر جذبہ ہے۔ عالمگیر اخوت اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ ہمارے ایرانی بھائیوں کے ان جذبات سے فائدہ اٹھائیں اور اسلام کی خدمت میں اس سے کام لیں، اور اس میں مزید ترقی کی کوشش کریں۔ اس لئے کہ افتراق اور غلو سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً شدید نقصان پہونچا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں تو اس اختلاف کی شدت نے تاریخ کے سب سے بڑے سانحہ سقوط بغداد کو جنم دیا۔ اسی اختلاف اور غلو پسندی نے

شیخ سعدی شیرازی نے مسلمانوں کے اس المیہ اور رنج کے اس عظیم سانحہ پر خون رو کر مرثیہ لکھا ہے

(باقی صفحہ پر)

مسلمانوں کو یورپ فتح کرنے اور اس کے آخری حدود تک جانے میں رکاوٹ ڈالی، اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں پہلے حکومت کمزور ہوئی پھر آخر میں اس کا چراغ ہی گل ہو گیا۔

۲۔ ایران کے سفر میں دوسری چیز جس سے مجھے مسرت ہوئی، وہ اسلامی آثار سے دلچسپی، عربی زبان سے تعلق، اسلامی کتابوں کی اشاعت، علماء کے کارناموں کے احیاء اور قرآن کی تحریر، کتابت و طباعت سے دلچسپی و شیفتگی ہے، وہاں ایران میں نادر قرآنی مخطوطات کی حفاظت و اہتمام، اور قرآن کی اعلیٰ نفیس طباعت دیکھ کر ایرانیوں کے قرآن کی عظمت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے، جلسوں وغیرہ میں قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے، خاص طور سے مصری قراء کی تلاوت کی ہوئی آیات ٹیپ ریکارڈ سے سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

۳۔ وہاں ایرانیوں کی دینی غیرت و حمیت دیکھ کر بھی خوشی ہوئی، وہ اسلام کے خلاف سازشی تحریکوں کے بارے میں خاصے حساس واقع ہوئے ہیں، بہائیت[1] جو ایران ہی میں پیدا ہوئی قانونی طور پر ممنوع ہے، اور بہائی مذہب کے ماننے والوں کو اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے، اسی طرح قادیانیت کو بھی خارج از اسلام فرقہ سمجھا جاتا ہے، اور اس سے دینی حلقوں میں خاصی نفرت پائی جاتی ہے، کمیونزم اور دہریت کے ساتھ دشمنی میں بھی ایرانیوں کی غیرت و حمیت اسلامی ملکوں کے لئے خاص طور پر پاکستان کے لئے قابل رشک اور قابل تقلید ہے، جس کے ایران سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔

(باقی صفحہ ۹۷ کا) اس کا مطلع یہ ہے ؎

آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمین   بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

[1] ہمیں اپنے سفر کے دوران یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ بہائیوں کے اثرات ایران میں بڑھتے جا رہے ہیں، بعض کلیدی عہدے ان کے ہاتھ میں ہیں اور بعض اہم سرکاری شخصیتوں پر بہائی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔

۴۔ حسن اخلاق، شیریں زبانی، مہمان نوازی اور تواضع یہ وہ امتیازی اوصاف ہیں جن کا تجربہ ایک مسلم سیاح کو ایران میں قدم قدم پر ہوتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے درمیان اپنے ہی وطن میں ہے، ہمیں جس شہر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہم نے وہاں حکومت کے ذمہ داروں، شہر کے شرفا اور معززین کو اپنا منتظر اور چشم براہ پایا، جب ہم کار کے ذریعہ شہر قم جا رہے تھے، تو اگرچہ ہمیں پہنچنے میں خاصی تاخیر ہو گئی تھی، لیکن ہم نے حکومت کے ذمہ داروں، اور علما و معززین کو راستے کے دونوں طرف دھوپ میں منتظر پایا" اس مختصر سفر میں ہمیں اس کا بار بار تجربہ ہوا۔

آخر میں ہم اپنے ایرانی بھائیوں، اور علما و قائدین کو چند اہم امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

۱۔ انسان اور کائنات کی تخلیق کا بنیادی مقصد، اور انبیا علیہم السلام کی بعثت اور صحف سماوی کے نزول کی غرض و غایت یہی تھی کہ اس دنیا میں خدائے تعالیٰ کی عبادت ہو، اور اسی کو لائق پرستش سمجھا جائے، اطاعت شعاری، وفاداری، خشوع و خضوع، اور محتاجی و بندگی کا احساس، یہ وہ صفات ہیں جو بندے میں خدا کو وحدہ لاشریک ماننے سے پیدا ہوتی ہیں، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہی تھا کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ قلبی اور جسمانی طور پر مربوط و وابستہ کر دیں، اور مخلوق کو جسم و جان کے ساتھ خالق کی طرف متوجہ کر دیں، اور اس کی چوکھٹ پر اس کا سر جھکا دیں، انبیاء علیہم السلام کا یہی مقصد حیات یہی تمنا و آرزو، اور ان کی خوش قسمتی و سعادت کا یہی معراج کمال تھی اس سے ان کی روح کو راحت، اور قلب کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی، وہ اس دنیا میں اس لئے تشریف نہیں لائے تھے کہ خالق و مخلوق کے درمیان سد راہ بنیں، یا انسانوں کو کسی خاص گھرانے

سے ملک، اور کسی خاندان کا فرماں بردار یا کسی نسل و خاندان سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیں۔

قوموں اور رشتوں کا تقدس، نسلی و خاندانی غرور، اپنے بیٹوں اور پوتوں کے لئے پیشوائی کی گدی قائم کر جانا، اور ان کے لئے بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈال جانا، اور دائمی سیادت و قیادت کی مسند قائم کرنا جو ان کی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے، ان کے مالی مفادات کو صدیوں کے لئے محفوظ کر جانا، اور اس کا انتظام کر جانا کہ ہمیشہ کے لئے ان کے مافوق البشر ہونے کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں رہے، اور ان کے امتیازات کے گن گائے جاتے رہیں، بانیان سلطنت، حوصلہ مند قائدین، دنیا طلبوں اور مادی منافع کے پرستاروں کی نفسیات رہی ہیں، جن کی مثالیں بکثرت حکومتوں اور شاہی خاندانوں کی تاریخ میں بآسانی ملتی ہیں، انبیاء علیہم السلام ان باتوں سے ماورا، اور ان کی ذات گرامی ان تمام آلائشوں سے پاک و صاف ہوا کرتی ہے، قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت و دعوت اور ان کی ذات گرامی کی اس خصوصیت کو بڑے بلیغ اور موثر انداز میں بیان فرمایا ہے:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ	کسی بشر کے لئے یہ روا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا	اور حکم و نبوت کا منصب عطا فرمائے پھر وہ
عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا	لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے سوا میرے بندے
رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ	بن جاؤ، بلکہ وہ یہی تعلیم و ہدایت دے گا کہ تم
وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝	جس طرح کتاب اللہ پڑھتے پڑھاتے ہو اس کے
وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ	مطابق ربانی یعنی صرف اللہ کے پورے فرمانبردار
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۝ اَيَاْمُرُكُمْ	بندے بن جاؤ، وہ تم کو ہرگز یہ حکم نہیں دے گا کہ

بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ○ (آل عمران ۷۹-۸۰)	تم فرشتوں اور نبیوں کو ارباب بنا لو کیا وہ تمہارے مسلم ہو جانے کے بعد تم کو کفر کا حکم دے گا۔

اسی بنا پر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی چیزوں سے ہمیشہ بچتے رہا کرتے تھے، اور کسی ایسی بات کو قطعاً گوارا نہیں کرتے تھے جس سے غیر اللہ کے لئے کسی خدائی تقدیس و تعظیم کا شائبہ بھی نکل سکے، یا عبد و معبود کے درمیان کوئی حائل ہونے کی کوشش کرے، اور ایسی تعظیم و تقدیس کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی غیر اللہ کے لئے پیدا ہو، خواہ اس کا تعلق انہی کی ذات سے ہو یا کسی تاریخی آثار، عبادت گاہ، یا مزار سے ہو، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے اللہ تو میری قبر کو ایسا بت نہ بنا جس کی پرستش کی جائے ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوا جنھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔[1] پھر ارشاد فرمایا: یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔[2] انھوں نے جو کچھ کیا اس سے آپ ڈراتے تھے، ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: لا تجعلوا قبری عیدا[3] (میری قبر کو جشن نہ بنالو) اس موضوع پر احادیث کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔

گذشتہ قوموں کی تاریخ اور تجربات نے یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ جس جماعت اور قوم نے بھی زیارت گاہوں اور قبروں پر جشن منانا شروع کیا وہ بالآخر حرم مقدس اور مسجدوں سے بے پروا، نماز با جماعت کے اہتمام سے بے تعلق، اور ہر مصیبت و آفت کے وقت خدا کے سامنے جھکنے، اسی کی طرف رجوع کرنے، اور

---

[1] موطا۔ [2] متفق علیہ۔ [3] ابوداؤد، اس روایت کے راوی اہل بیت کرام ہیں۔

جذبۂ عبودیت و بندگی سے خالی ہو گئی[1]

ایران کے دوران قیام ہم نے مسجدوں کی بہ نسبت زیارت گاہوں کو زیادہ معمور، پُر رونق، اور زائرین سے آباد دیکھا جس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کو ان مزاروں سے غیر معمولی لگاؤ اور قلبی تعلق ہے، جب ایک سیاح سیدنا امام علی رضا کے مزار پر حاضر ہوتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی مزار پر نہیں بلکہ حرم میں ہے، جو حجاج سے بھرا ہوا ہے جہاں آہ و بکا کی صدائیں ہر طرف بلند ہیں، مردوں اور عورتوں کے غیر معمولی اژدحام کا عجیب منظر ان مشاہد میں نظر آتا، غیر معمولی تزئین و آرائش، دولت مندوں اور اہل ثروت کے نفیس تحائف، اور مختلف طبقوں کے زائرین کے نذر و نیاز کے ڈھیر پڑے نظر آئے، حرم مکی اور حرم مدنی اور اس مزار کے درمیان بمشکل امتیاز کیا جا سکتا ہے، یہی حال تھوڑے فرق کے ساتھ قم میں سیدہ معصومہ کے مقبرہ کا ہے۔

ایران میں مسجدیں عظیم الشان اور فن تعمیر کے اعتبار سے تو بعض مسجدیں نادر نمونہ ہیں، ان کی نظیر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی بمشکل سے ملے گی، لیکن مقابر و مزارات کے مقابلہ میں ان کی حالت عبرت ناک ہے، ان مسجدوں میں نہ مقابر و مزارات کی طرح بھیڑ نظر آتی ہے، اور نہ وہ جوش و جذبہ اور قلبی تعلق نظر آتا ہے، جو ان مزارات پر دیکھنے میں آتا ہے، بیشتر مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" ہم مذہب اثنا عشری میں عبادات کے خصوصی مسائل اور جمع بین الصلاتین" اور امامت کے نازک شرائط سے بے خبر نہیں ہیں، ہمکو اس کا اندازہ ہے کہ فقہ جعفری میں بہت سی ایسی گنجائشیں ہیں،

---

[1] رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی تو آپ نماز میں مصروف ہو جاتے۔ (ابو داؤد)

جو مذاہب اہل سنت میں نہیں ہیں، اس کے باوجود ہمارا احساس ہے کہ یقیناً ممکن تھا کہ مسجدیں نمازیوں سے اس سے زیادہ معمور نظر آتیں، اور تسبیح و تلاوت کی آواز سے گونجتیں اور مقابر و مزارات کے مقابلہ میں یہاں زیادہ آبادی اور زندگی پائی جاتی، امید ہے کہ ایران کے علماء و فضلاء، اور جو لوگ دینی غیرت سے بہرہ مند ہیں (اور ان کی بڑی تعداد ہے) وہ اس اہم مسئلہ کی طرف اپنی خصوصی توجہ منعطف کریں گے، یہاں تک کہ باہر سے آنے والے کو مساجد و مشاہد کا اتنا فرق نہ محسوس ہوگا۔[1]

---

[1] اس حقیقت و واقعیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ قبر پرستی، اور دور سے اس مقصد کے لئے خصوصی سفر، سالانہ عرس و اجتماع، اور مشرکانہ اعمال و رسوم برصغیر ہند و پاک و مصر کے اہل سنت میں بھی بکثرت مروج ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ ہر زمانہ میں سلف سے خلف تک ایسے حق گو اور صداقت کے علمبردار علماء بڑی تعداد میں موجود رہے جنھوں نے ان بدعات اور مشرکانہ رسوم و رواج کی کھل کر مخالفت کی اور اس کی بیخ کنی کے درپے رہے اس راہ میں انکو جہلاء و عوام کے غیظ و غضب کا بھی نشانہ بننا پڑا، لیکن وہ ہمیشہ عوام کو ان گمراہیوں سے بچتے رہنے کی تلقین کرتے رہے اور کسی ملامت اور مخالفت کی پرواہ کئے بغیر حق گوئی و بے باکی سے توحید خالص کی دعوت دیتے رہے، ان مصلحین سے عالم اسلام کا کوئی خطہ اور تاریخ اسلام کا کوئی وقفہ خالی نہیں تھا

مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) کی کتابیں قبر پرستی اور مشرکانہ بدعات و رسوم کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں، اثنا عشری حضرات کی اصلاح و تجدید کی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں، ہمیں اس کا علم نہیں کہ شیعہ حضرات میں ایسے داعی و مصلحین پیدا ہوئے ہیں یا نہیں، جنھوں نے قبر پرستی اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف اعلان جہاد کیا ہے۔ توحید خالص کی دعوت میں کسی مخالفت و خطرہ کی پرواہ نہ کی ہو۔

اہل بیت کی عقیدت و محبت میں غلو کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور ائمۂ اہل بیت کی تصویریں کثرت سے گھروں اور مسجدوں میں نظر آتی ہیں بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصاویر بھی جا بجا آویزاں نظر آئیں، خاص طور پر مسجد سپہسالار تہران میں وہ بری طرح سے آنکھوں کو چبھیں، یہی تصویریں بت پرستی اور شرک کی سمت لے جاتی ہیں یہ گزشتہ قوموں نے صلحاء و اولیاء کی تصویریں اور مجسمے تراش کر بت پرستی کی بنیاد ڈالی تھی، اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کو اس خطرہ سے محفوظ رکھے اور تمام مشرکانہ رسوم و رواج سے حفاظت فرمائے۔[1]

۲- حضرات ائمہ اہل بیت ہمیشہ تاریکی میں مینارۂ نور، اور ہدایت و رہنمائی کے امام رہے ہیں، اس میں کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ان ائمہ اہل بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق اور اہل بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک جو عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے، اور ہمارا تاثر ہے کہ اس شیفتگی و شغف نے اس تعلق و محبت کو کسی حد تک مجروح اور کمزور کر دیا ہے جو نبوت محمدیؐ اور ذات نبوی کے ساتھ ہر مسلمان کا ہونا چاہیے جس کی وجہ سے اہل بیت نے عزت و شرف کا مقام حاصل کیا، اور وہ ہماری محبت و تعظیم کے مستحق قرار پائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی ربط و تعلق کا ایک حصہ جو اس ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھا، اس تعلق میں داخل ہو گیا۔

---

[1] صحیح بخاری میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک گرجا گھر کا ذکر کیا جو انھوں نے اپنی ہجرت کے موقع پر ملک حبش میں دیکھا تھا، انھوں نے ان تصویروں کا بھی ذکر کیا جو حضرت (باقی صفحہ پر

چنانچہ ایران کے اخیر دور کے نعتیہ کلام میں (جس کی کچھ زیادہ مقدار نہیں ہے) وہ جوش خروش، طبیعت کی روانی اور مضامین کی آمد نہیں ہے، جو ان نظموں میں نظر آتی ہے، جو مناقب اہل بیت، مرثیے، اور خاص طور پر سیدنا علی مرتضیٰؓ اور حضرت حسینؓ کی مدح و توصیف اور مصائب اہل بیت کے بیان میں کہی گئی ہیں۔ یہ فرق شیعہ حضرات کے یہاں ہر جگہ نعت نبویؐ اور اہل بیت کی مدح و توصیف کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے، اردو میں انیس و دبیر کے مرثیے پڑھئے، اور اس کا خود ان کے اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام سے مقابلہ کیجئے، جو ان کے ہم مسلک اور ہم مذہب تھے، دونوں میں آمد و آورد، اور اصل و نقل کا فرق محسوس ہوگا، کم و بیش یہی فرق سیرت نبوی، اور مناقب اہل بیت میں پایا جاتا ہے، یہی چیز ہم نے ایران میں دیکھی کہ وہاں مشاہد و مقابر سے جو تعلق ہے، وہ مساجد سے نہیں معلوم ہوتا، نجف و کربلا، اور عتبات عالیہ کے سفر کا جو شوق ہے وہ حرمین شریفین کی زیارت اور سفر حج کے سلسلہ میں نظر نہیں آتا۔[1]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) عیسیٰ اور مریم کی وہاں موجود تھیں، اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا دستور تھا کہ جب کسی نیک آدمی یا نیک بندہ کا انتقال ہوتا تو اس کی قبر پر مسجد کی تعمیر کرتے، اور اس مسجد میں اس کی تصویریں لگاتے، اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین خلائق میں ان کا شمار ہے۔

سیرت ابن ہشام کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور آپ نے فرشتوں وغیرہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویریں دیکھیں تو آپ نے حکم دیا کہ یہ سب تصویریں مٹا دی جائیں۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۱)

[1] ادھر چند برسوں سے ایرانیوں میں حج کے سفر کا شوق، اور ایرانی حجاج کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے، حکومت ایران اور وہاں کے محکمۂ اوقاف نے اپنے حجاج اور زائرین کی سہولت و راحت کے لئے جو انتظامات کئے ہیں، وہ بھی قابل تعریف، اور قابل تقلید ہیں۔

ہو سکتا ہے وہ ہمارے اثنا عشری بھائیوں میں یہ رد عمل اہل سنت کے بعض علماء اور پرجوش حضرات کے رویہ اور اہل بیت کے حقوق کے اعتراف میں کوتاہی سے ہوا ہو لیکن یہ بات رد عمل سے کچھ آگے بڑھ گئی ہے، محبت و عقیدت، جوش و جذبہ اور تقدیس و تعظیم کا جو ہالہ اس روحانی مرکز کے گرد بن گیا ہے، اور اس کی مدح و توصیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کا حریف اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنا دے اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کا دھارا ایک ایسے مرکز کی طرف مڑ جانے کا جو افضل الانبیاء خاتم النبیین رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھے گا۔

اس نقطۂ نظر کے اثرات و نتائج شعر و ادب، اور سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی ظاہر ہونے قدرتی ہیں، ہم اس کی تفصیل میں زیادہ جانا نہیں چاہتا، لیکن ہمارے منصف مزاج ایرانی بھائی اپنے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کریں، تو انھیں اس کا اندازہ ہوگا کہ خواہ وہ فیصلہ ان باتوں سے اتفاق نہ کریں، تاہم یہ باتیں ان کو از سر نو غور کرنے کی دعوت ضرور دیتی ہیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ائمہ اہل بیت دین اور توحید خالص کی دعوت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح جانشین تھے، وہ ہر اس چیز کے دشمن تھے جو مخلوق کو اپنے خالق سے غافل کر دے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دین کو لے کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے، وہ اس کے حق میں سب سے زیادہ غیرت مند تھے اور کسی ایسی چیز کو قطعاً گوارا نہیں کرتے تھے جو خالق و مخلوق کے تعلق کو کمزور کر دے یا مخلوق کو مخلوق کے ساتھ مشغول کر دے، ان کی دعوت و کوشش مخلوق کے بجائے خالق سے رابطہ قائم کرنے، ظاہر و دنیا سے بے رغبتی، زہد و توکل کی زندگی، اور علم نافع کی اشاعت میں مشغولیت تھی۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور شیعہ سنیوں کے درمیان وسیع اور گہری خلیج کو پُر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جذبات و تعلق کے اس کرنٹ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت اور آپ کی نبوت کی طرف موڑ دیا جائے، اس لئے کہ آپ کی ذات گرامی مسلمانوں کا مرکز توجہ ہے، اور آپ کی نبوت ہی سے چشمہ ابلتا ہے اور آپ ہی وہ روشن چراغ ہیں جس نے پوری دنیا کو منور کیا ہے۔ یہ ایسا عظیم الشان تجدیدی کام ہے، جس کے لئے نہایت قوی الارادہ، صاحب عزم، بلند ہمت مصلحین و مفکرین کی ضرورت ہے۔ جب کبھی یہ کام پورا ہوگا، اسلام کی فکری اور تجدیدی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز اور بے نظیر کارنامہ ہوگا۔ اسی ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر حقیقی اور فطری اسلامی اتحاد قائم ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ ہر کوشش مصنوعی اور غیر فطری ہوگی۔

۴۔ اگر اثنا عشری حضرات خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے قریب آئیں، اور وہ صاف دل سے متحد ہو کر ایک مرکز پر جمع ہوں تو انھیں صحابہ کرامؓ اور امہات المومنین کے بارے میں اپنے طرز فکر میں تبدیلی کرنی ہوگی، اس لئے کہ افراد اور جماعتوں کی محبوب و محترم شخصیتوں کا جب تک احترام نہ کیا جائے گا، اس وقت تک یکجہتی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دو آدمی ایک مقصد کے لئے جوش و خلوص، صفائی دلی اور جذبہ و تعاون سے آپس میں مل بیٹھیں، لیکن ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے ہاں کی محبوب و محترم، اور محبت و عقیدت کی مرکزی شخصیت کو نامناسب الفاظ میں یاد کرے، طنز و تشنیع اور بے سروپا الزامات لگانے کو خدا کے یہاں تقرب کا ذریعہ خیال کرے، ہم میں سے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہے، جب اساتذہ و شیوخ اور آباؤ اجداد کے بارے میں ہمارا یہ تجربہ ہے تو بھلا ان پاک نفوس کے بارے میں ہمارا کیا حال ہوگا جن کو

انسان اپنے آباؤ اجداد اور اساتذہ و شیوخ سے کہیں زیادہ افضل اور برتر سمجھتا ہے اور ان پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، اور ان کو دین کا سچا خادم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا جان نثار فدائی خیال کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ صحابہ کرام نے خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے اور دینی دعوت کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اور دنیا کی زندگی میں زہد و تقشف اور ایثار و قربانی کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

اس جذباتی پہلو سے قطع نظر اس مسئلہ کی بہت بڑی تبلیغی اہمیت اور علمی قدر و قیمت ہے، لوگ ہمیشہ دعوت کی صداقت اور کسی مذہب کی تعلیمات کی خوبیوں کا فیصلہ اس سے کرتے ہیں کہ اس دعوت نے کیسے اخلاقی نمونے اور عملی مثالیں پیش کیں، اس دعوت نے اپنے ابتدائی دور میں کس طرح کی نسل تیار کی، اور آدم گری و مردم سازی کا کیا کمال دکھلایا، قائد کو اپنی تعلیم و تربیت میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی؟ اساتذہ و معلمین، قائدین و مصلحین اور ماہرین فن صناعوں کی کامیابی کا بھی ہمیشہ سے یہی معیار رہا ہے، اگر ان کو اپنی کوششوں میں معتدبہ کامیابی حاصل ہوئی، اور انھوں نے خاصی تعداد میں ایسے لوگ تیار کئے جن سے ان کے کمال فن کا اظہار ہوتا تھا اور ان کی محنت ٹھکانے لگتی تھی، تو ان کی فنی مہارت اور ان کی قیادت بجا طور پر تسلیم کر لیا گیا اور ان کو اس فن کا امام اور اپنے مقصد میں کامیاب مان لیا گیا، لیکن اگر ان کی کوششوں کے نتائج برائے نام رہے، کامیابی بہت محدود پیمانے پر ہوتی ہے، یا اپنے شاگردوں اور ماننے والوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی جد و جہد ضائع ہو جاتی ہے، اور یہ شاگرد اپنے اساتذہ اور مربیوں کے اس دنیا سے جاتے ہی ان کی جد و جہد کو ناکام ثابت کر دیتے ہیں، اور ان کی تربیت کے اثرات بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں، تو ان اساتذہ اور مربیوں کو اپنی تعلیم و تربیت کی مہم میں ناکام سمجھا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ جب یہ دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دورِ عروج میں کوئی دیرپا اور گہرے نقوش مرتسم نہ کر سکی اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے ابتداء ہی میں اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جس صراطِ مستقیم پر صحابہ کرامؓ کو چھوڑا تھا ان میں سے معدودے چند آدمی ہی اس پر گامزن رہ سکے، تو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ اس کے اندر نفوس کے تزکیہ کی صلاحیت ہے اور وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلندی تک پہونچا سکتی ہے۔

دعوت و تبلیغ کی ایک اہم ضرورت، نیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی سیرت و تاریخ کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحابہ کرامؓ کے محاسن کا اعتراف کریں، ان کے کارنامے کی عظمت و اہمیت، ان کی وفاداری، باہمی محبت و تعاون علی الحق کے نقوش کو اجاگر کریں، اور اس تابناک تاریخ کا پُر رونق ورق دنیا کے سامنے پیش کریں ــــ ان کی بھول چوک اور بشری کمزوریوں کی حیثیت تاریخ کے صاف شفاف صفحہ پر ایک سیاہ نقطے سے زیادہ نہیں، صحیح منطق اور عقل سلیم بھی اس موقف کو قبول کرتی ہے اور قرآن مجید اور مستند تاریخ سے بھی یہی موقف درست ثابت ہوتا ہے، قرآن مجید نے بھی سابقین اولین اور سلف صالحین کے متعلق اسی روش کو قابل تعریف قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:-

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِھِمْ یَقُوْلُوْنَ	اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا	ہوئے اے رب بخش ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو
بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا	جو ہم سے پہلے ایمان میں داخل ہوئے اور نہ رکھ

غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (الحشر ۱۰)	ہمارے دلوں میں بیر ایمان والوں کا اے رب! تو ہی نرمی والا مہربان ہے!

گزشتہ قوموں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے حواری اور رفقاء مخلوق خدا میں سب سے بہترین لوگ ہیں۔ یہ قومیں اپنے پیغمبروں کے حواریوں اور رفیقوں کی محبت و عقیدت میں معروف و مشہور تھیں، اس لئے ہمیں صحابہ کرام سے اور زیادہ محبت و عقیدت ہونی چاہیے جو اس نبی کے رفیق و حواری ہیں جس نے اس دنیا پر سب سے زیادہ گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (الجمعہ ۲)	وہی ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا، وہ پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیات اور سنوارتا ہے، اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب و حکمت اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ (الفتح ۲۸)	وہ اللہ وہی ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور اللہ کافی گواہ ہے۔

اگر ہم مختلف مسالک کے لوگوں کو قریب کرنے کے لئے خلوص دل سے کوشش کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ کوشش ٹھوس اور فطری بنیاد پر ہونی چاہیے، اس نفسیاتی اور فطری راستے کے علاوہ جو کوشش بھی کی جائے گی، وہ ناکام اور غیر فطری ہوگی۔ ہم نے ایک دفعہ علامہ تقی القمی (جو اس مقصد کے لئے تیس سال سے کام کر رہے ہیں) کی مجلس میں عرض کیا تھا

ہمارے یہاں اردو کی ایک مثل ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ میں اس میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ صرف دو ہاتھ بھی کافی نہیں، ان میں خلوص، عزم اور سنجیدگی بھی ہونی چاہیئے۔ اگر کسی ہاتھ میں ڈھیلا پن اور سستی ہوگی، تو تالی نہیں بج سکتی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ تقریب بین المذاہب کوئی رسمی عمل نہیں، زبان سے زیادہ اس کا تعلق دل سے ہے، اور خارجی مسئلہ سے زیادہ اس کا تعلق اندرونی مسئلہ سے ہے۔ ابھی کسی ایسے گوند کی ایجاد نہیں ہو سکی جس سے کاغذ کی طرح دل بھی جڑ جائیں۔ اس لئے یہ خواہش اور جد و جہد دل سے اٹھنی چاہیئے اور اس میں اتنی روانی اور ابال ہونا چاہیئے کہ دل اس کی قوت اور حرارت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کے لئے آپس میں مفاہمت کرنی ہوگی، کچھ چیزوں سے دست بردار ہونا اور کچھ کسر و انکسار سے کام لینا پڑے گا، لیکن ایک بار جب ہمارے دل اس کو قبول کرنے پر تیار ہو جائیں گے، تو محبت و اعتماد کے سیل رواں کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکے گی۔ اس لئے کہ محبت اپنی راہ کی ہر رکاوٹ، ہر بغض و عداوت کی ہر کدورت کو بہائے جاتی ہے۔

۴۔ آخر میں ایران کے اہل علم و اہل دین کی توجہ قرآن سے زیادہ اعتناء کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ایرانی بھائی قرآن کریم کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، ان کو اس سے محبت ہے، اور وہ اس سے بے تعلق نہیں۔ اہل ایران قدیم زمانہ سے قرآن کی زرین کتابت و نقاشی میں آگے رہے ہیں، اس کو کتب خانوں اور میوزیم میں خاص اہتمام سے رکھنے اور اس پر فخر کرنے اور بہتر سے بہتر طریقہ پر زیور طباعت سے آراستہ کرنے میں اب بھی وہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایران کے قدیم و جدید علماء نے قرآن مجید کی بلند پایہ تفسیریں بھی لکھی ہیں، جن میں سے متعدد ہندوستان میں بھی مشہور و متداول رہی ہیں۔

لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے ساتھ ایرانیوں کا تعلق اس سے کہیں زیادہ گہرا ہونا چاہیئے، اس کی ضرورت ہے کہ اس کا ذوق ہر ذوق پر غالب، اور اس کی روح جسم و جان میں ساری و جاری ہو، جس کا ایک نتیجہ کثرت تلاوت، اور حفاظ کی کثیر تعداد کی شکل میں ملک میں دیکھا جا سکے، اس کو ہر چیز پر ترجیح دی جائے، اس کو ہر مسئلہ میں رد و قبول کا معیار اور حسن و قبح کی میزان سمجھا جائے، وہی ہمارے علم و ادب، عقیدہ و عمل، اور سیرت و اخلاق کا سدرۃ المنتہیٰ ہو۔

مجھے اس میں شک نہیں، ہمارے ایرانی فضلاء اور مفکرین ان پیش کردہ حقائق میں سے بعض حقیقتوں کو محسوس کرتے ہیں، اور ان کی اشاعت و ترویج، اور تقویت کی ضرورت کا انہیں اعتراف ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک عظیم الشان تجدیدی کام ہے، اور اس سے وہی باکمال شخصیتیں عہدہ برآ ہو سکتی ہیں، جو اپنے علمی وقار و احترام کو داؤں پر لگا دیں، اور اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار ہوں، لیکن اس کامیابی سے جو خوشی و مسرت حاصل ہوگی اس سے بڑھ کر کوئی مسرت نہیں ہو سکتی، اس سے تاریخ ان کو جس عزت و احترام کے مقام پر رکھے گی اس کی برابری کوئی عزت و مرتبہ نہیں کر سکتا، اسلام کی صاف و شفاف پیشانی، اور اس کی حقیقت پر جو گرد و غبار اٹ گیا ہے، تاریخ کے ملبہ نے جس طرح اس کے رخ زیبا کو چھپا لیا ہے، اور جمود و تقلید کی جو دبیز تہہ جم گئی ہے، اس کو ہٹانا، اور قرن اول میں دین کی جو حالت تھی، وہ حالت پھر سے پیدا کرنا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں، بلکہ بہت بڑا جہاد اور عظیم الشان تجدیدی کام ہے، توحید خالص اور حقیقت دین کو اپنانے کے لئے قرآن کی دعوت صرف دوسرے مذاہب اور غیر مسلم اقوام ہی کو نہیں، امت کے تمام طبقوں اور گروہوں سے بھی ہے، وہ کسی عہد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لئے یکساں ہے۔

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ	آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا	کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہرائیں
یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ	اس کا کسی کو اور نہ بنائے کوئی کسی کو رب
(آل عمران ۶۴)	سوا اللہ تعالیٰ کے۔

ہم اپنے ایرانی بھائیوں سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ معروضات محض خلوص و نیت، اسلامی اتحاد کی زبردست خواہش اور ذمہ داری کے احساس کی بنا پر پیش کی گئی ہیں، اگر آپ کو بین السطور کوئی ایسی چیز نظر آئے جس سے آپ اتفاق نہ کر سکیں، یا حقیقت و واقعیت کے خلاف افراط و تفریط دیکھیں، تو ہم معذرت خواہ ہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ بے عیب ذات صرف خدا کی ہے۔

ایرانی دوستوں سے ایک سوال

ایرانی بھائیوں سے رخصت ہونے سے پہلے ہم ان کے سامنے ایک ایسا سوال رکھنا چاہتے ہیں، جو بہت سے دماغوں میں ابھرتا رہا ہے، وہ سوال یہ ہے کہ آخر ایران جیسا زرخیز و مردم خیز ملک جس نے گذشتہ دور میں بھی :........ ہر علم و فن اور زندگی کے ہر میدان میں بڑی تعداد میں ایسے جینیس اور عبقری انسانوں کو پیدا کیا جو اپنی غیر معمولی ذہانت و صلاحیت میں عام سطح سے بلند نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ طبقات و تراجم اور سیرت و تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ایران میں بجز جینیس اور عبقری انسانوں کے اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا، اور لکھنؤ میں ہر ایک باذوق گھر ہی کا ہوتا ہے، لیکن ایران کے دور آخر پر نظر رکھنے والا حیرت و تعجب سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس زرخیز ملک میں

باکمال انسان پیدا ہونے کیوں بند ہوگئے، اسلامی علوم وفنون میں مہارت، ذہانت وذکاوت علمی تحقیق حتیٰ کہ ادب وشاعری یکسر انحطاط وزوال کا شکار کیوں ہوگیا؟ صدیاں بیت گئیں، نسلوں پہ نسلیں گذر گئیں اور کسی ایسے عالم، ادیب وشاعر، مصنف ومحقق، ریاضی داں، فلسفی یا ایسے قائد ورہنما کا نام تک نہیں سننے میں آتا جو اپنے کارناموں سے دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے، اور زمانہ کی آنکھوں کو خیرہ کردے، دسویں صدی ہجری کے بعد یہ خلا اس شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال جیسا ایرانی ادبیات کا گرویدہ اور ایران کی تاریخ کا سچا طالب علم بھی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگل ایران، وہی تبریز ہے ساقی

ہم نے ایرانی علماء اور دانشوروں کے سامنے بھی یہ سوال پیش کیا اور ان سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال بھی کیا، مگر کوئی تشفی بخش جواب ہمیں نہ مل سکا، یہ سوال ہمارے ذہنوں میں برابر گونج رہا ہے کہ ایران کے جمود وانحطاط کا کیا یہ سبب تھا کہ خیالات کی بلندی وحوصلہ مندی، دانش کے خلاف بغاوت، حقیقت کی جستجو، سازدل کو چھیڑنے اور روح کے سرچشموں کو جاری کرنے میں جس تصوف نے مرکزی اور بنیادی کردار ادا کیا تھا، اس کا خاتمہ ہی انحطاط کا حقیقی سبب ہے، یا اس زوال وانحطاط کی وجہ وسائل کی فراوانی، زندگی کی آسانی، اور عمومی فارغ البالی ہے جس سے ایران کو مدت دراز سے متمتع ہونے کا موقع مل رہا ہے، اور جس کی وجہ سے طبیعتوں میں سہولت پسندی، اور عزائم میں افسردگی اور پستی پیدا ہوگئی ہے، یا اس انحطاط وجمود کی علت یہ ہے کہ علم ومسلک کے بارے میں ایران میں عرصہ سے ایک مخصوص ومحدود شکل پر انحصار کر لیا گیا ہے، اور اس کے علاوہ دوسرے مسلک

اور ہر نظام کو ملک سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح ایران صفویوں کے دور کے بعد سے ایک خول میں زندگی گذار رہا ہے، اور اس کو باہر کی علمی دنیا کے جھونکے جو اس کے علمی وفکری قویٰ میں حرکت پیدا کریں، اور اس کے علمی وادبی ذخیرے میں اضافہ کریں، نہیں پہونچنے پاتے، یا اس سے زیادہ کوئی اور گہرا سبب ہے جس کی طرف ہماری نظر نہیں پہونچ سکی۔

فلسفۂ تاریخ اور قوموں کے عروج وانقلاب سے اس سوال کا گہرا تعلق ہے، حقیقت تک رسائی اور علمی تحقیق کے لئے اس سوال کا تشفی بخش جواب ضروری ہے، ہم یہ جواب اسی ایران سے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس نے اپنی علمی وادبی صلاحیت، وذہانت سے ایک عرصہ تک پوری دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا، اس کو اس اہم اور نازک سوال کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اور اپنی گذشتہ شاندار تاریخ کو اسے پھر دہرانا چاہئے، یہ بات ایران، عالم اسلام بلکہ انسانی دنیا کے مفاد میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی جس نے خفتہ ایران کو بیدار کر دیا

(یہ اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ ۱۵ر جون ۱۹۷۳ء کو اس جلسۂ استقبالیہ میں کی گئی تھی جو آیت اللہ العظمیٰ مرزا خلیل کمرہ ای کی صدارت میں واقع زینبیہ ہال تہران میں منعقد کیا گیا تھا ترجمہ مولوی بلال اصلاحی ندوی کے قلم سے ہے)

حضرات! ابھی آپ کے سامنے قاری نے سورۂ آل عمران کی مشہور آیت کی تلاوت کی۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا	اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو
تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ	اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم
اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ	نااتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ	ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس
عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ	اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت
مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ	ڈال دی سو تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(آل عمران - ۱۰۳)

بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے
گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ
نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ
تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے
ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

ہمارے فاضل دوست استاد احمد محمد جمال نے اس آیت کے پہلے حصے پر بحث کی ہے میں اس کے دوسرے حصے یعنی:۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ
فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(آل عمران - ۱۰۳)

اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے
سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی
اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام
بیان کر کے بتاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ
پر رہو۔

پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں، نیز اس پر غور و فکر کی دعوت دوں گا۔

حضرات! یہ آیت کریمہ ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے دلوں پر نقش رہنی چاہیے، اس آیت میں اس عظیم نعمت کا ذکر ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو سرفراز فرمایا ہے، اور اے باشندگان ایران آپ ہی تنہا اس نعمت کے مالک نہیں ہیں بلکہ ہم برصغیر کے رہنے والے، بلکہ اس روئے زمین پر بسنے والے تمام مسلمان، بلکہ اس جزیرۃ العرب کے باشندے بھی جہاں سے اسلام کی کرنیں پھوٹیں، اور ساری کائنات پر پھیل گئیں، اس عظیم نعمت میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔

ہم سب جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، نہ توحید و نبوت سے واقف تھے، نہ حشر و نشر کی خبر تھی، اخلاقی قدروں سے یکسر ناآشنا، اور صحیح مذہبی تعلیمات سے قطعاً بے بہرہ تھے، اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، ظالم و جابر حکومتوں کے جور و استبداد کا شکار تھے، انسانیت ہر طرف پامال ہو رہی تھی۔

ایک طرف مطلق العنان حکمران، دوسری طرف علم و مذہب کے اجارہ دار علماء معبود بنے بیٹھے تھے، عوام ان کی پرستش اور اندھی اطاعت پر مجبور تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ - ۳۱)	کو (باعتبار اطاعت کے) رب بنا رکھا ہے۔

اسلام آیا اور اس کی ضیا پاشیوں نے روئے زمین کے گوشے گوشے کو منور کیا۔

اسلام کی نعمت ساری انسانیت کے لئے عام تھی، وہ اس بارش کی طرح تھی جو سپید و سیاہ اور بندہ و آقا کے درمیان امتیاز نہیں کرتی، وہ تو باران تھا جو پست و بلند، گلشن و کہسار سب کو سیراب کر گیا، اور حق تو یہ تھا کہ اسے عربی شاعر کے اس قول سے مخاطب کیا جائے ؎

فاذهب كما ذهبت غوادي مزنة
أثنى عليها السهل والأوعار

ایک فارسی شاعر کا قول ہے جو زیادہ بلیغ ہے ؎

پرتو مہر بویرانہ و آباد یکیست
حسن چون تیغ کشد بندہ و آزاد یکیست

اس نعمت سے عظیم تر کوئی نعمت نہیں، یہاں تک کہ زندگی بھی، جو ہر لذت و سرور کا

سرچشمہ ہے اگر اسلام توحید خالص اور ایمان کی نعمت نہ ہوتی تو یہ زندگی ایک عذاب مسلسل ہوتی اور اس کی حیثیت جہنم تک پہونچنے کے لئے ایک پل سے زیادہ نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے ہمیں نوازا اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور اس نعمت کے حصول میں ہم پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی بعثت ورسالت اور دعوت وجہاد کا ناقابل فراموش احسان ہے۔

اقبال کا یہ کہنا کس طرح بے جا نہیں ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (علیہ الف الف تحیۃ) نہ ہوتے، اگر آپ کے اصحاب اور اہل بیت نہ ہوتے، اگر دعوت اسلامی کے وہ اولین داعی اور اس کی راہ میں جان کی بازی لگا دینے والے مجاہدین نہ ہوتے، تو نہ اسلامی ایران ہوتا، نہ اسلامی ہندوستان، نہ اسلامی مصر، نہ اسلامی شام، کسی بھی اسلامی ملک کا وجود نہ ہوتا، یہاں تک کہ وہ جزیرۃ العرب بھی جو ہماری محبت وعقیدت کا مرکز ہے اور جس کی طرف ہم رخ کرتے ہیں موجود نہ ہوتا، ہمارے اور آپ کے درمیان یگانگی کا رشتہ نہ ہوتا، خصوصاً جبکہ ہم مشرق اقصی کے باشندے ہیں اور آپ ایران کے، حضور ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمام ملکوں اور قوموں کو ایک شیرازہ میں منسلک کیا، مختلف دلوں اور دماغوں کو ملنے کا موقع نصیب ہوا، افکار وخیالات کا اختلاط ہوا، نت نئے علوم ومعارف نے جنم لیا، علم کا ایک چشمہ ہندوستان میں بہہ رہا تھا، تو دوسرا ایران میں، دونوں میں ایک طویل فاصلہ تھا، اسی طرح اور بھی نہ جانے کتنے چشمے ہزاروں سال پہلے اپنی تنگ راہوں میں رواں تھے، اسلام آیا تو اس نے ان بکھرے ہوئے بے شمار سوتوں کو ایک عظیم چشمہ صافی میں بدل دیا، اسے ایک بلند اور مشترک مقصد کی خاطر استعمال کیا، اور انسانیت کے لئے مفید اور نتیجہ خیز بنایا، اس طرح ہندوستانی وایرانی اور عربی وعجمی افکار کا ایسا نفع بخش اور خیر وبرکت سے معمور امتزاج وجود میں آیا جس کی

تمدن وثقافت کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، ایرانیوں کے ذوق جمال، وسعت خیال، لطافت احساس، اور عرب کی سلامتی طبع، بلند حوصلگی، حقیقت پسندی، اور اسلامی عقائد واعمال کا ایسا سنگم چشم فلک نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔

ایران اپنے خواب گراں سے بیدار ہوا، اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ملا، اس کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک گئیں، تو ایسا معلوم ہوا، گویا یہ سرزمین عبقریوں اور یکتائے روزگار شخصیتوں ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے، گویا علم وادب اس کے خمیر میں داخل ہے، ذوق جمال اس کی آب وہوا میں بسا ہوا ہے، گویا اس میں عالم، ادیب، شاعر، فن کار، یا صوفی، مربی، مدرس اور مصنف کے سوا کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا، اگر کوئی فقہ وحدیث، شعروادب، اور تصنیف وتالیف کے میدان میں چوٹی کی شخصیات کو بھی شمار کرنا چاہے تو شمار نہیں کرسکتا، تذکرہ وتاریخ کی کتابیں ان کے حالات اور کارناموں سے بھری پڑی ہیں، خدا معلوم کتنے ممالک نے ہندوستان کی طرح ایران کے اس علمی وادبی خوان یغما سے خوشہ چینی کی ہے، ہم سب ان کے علم وفضل کے بحر بیکراں سے اپنی تشنگی بجھاتے ہیں، ان کے شعروادب سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہیں، اور ان کی تقلید واتباع پر فخر کرتے ہیں۔

لیکن یہ تمام عبقری اور یکتائے روزگار شخصیات جن کے زبردست علمی کمالات وادبی معجز طرازیوں نے ساری دنیا کو محو حیرت کردیا، اسلام ہی کے نونہال اور دعوت اسلام ہی کے پیداوار تھے، ان سب کو اس نئے دین نے جنم دیا تھا، جس کو لے کر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اسلام اور اخوت اسلامی کے سایہ میں

آپ سے اسی مبارک ذات کا شرف حاصل ہوا آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مشرق و مغرب کے سارے مسلمان اسی عالمگیر اسلامی اخوت کے لئے بے قرار ہیں لیکن یاد رکھئے دنیا و آخرت کی ہر سعادت کا سرچشمہ اسلام اور محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے، جن کے ذریعے اللہ تعالٰے نے ہمیں گمراہی کے بعد ہدایت، ذلت کے بعد عزت، اور تنگ دستی کے بعد وسعت سے نوازا، اور جہل کے بعد علم، اور اختلاف و انتشار کے بعد اتحاد کی دولت سے مالا مال کیا۔

اسلامی تہذیب کے سوا کوئی ہماری تہذیب نہیں، اسلامی تاریخ کے سوا کوئی ہماری تاریخ نہیں، اسلام کے عطا کردہ عزت و سربلندی کے علاوہ ہمارے لئے کوئی عزت و سربلندی نہیں، ہم تمام محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ہی بھائی ہیں۔

آپ کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا، وہ خواہ امیر المومنین علی بن ابی طالب ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے ہی سے نصیب ہوا۔

اگر آپ نہ ہوتے تو کسی کو دین میں کوئی فضیلت حاصل ہوتی نہ ایمان و یقین کا کوئی حصہ کسی کو نصیب ہوتا، اور نہ کسی کے یہ حیرت انگیز کارنامے سامنے آتے، جو تاریخ کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں، اور جن پر مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے۔

اور آج بھی کسی شخص کو اگر اس سعادت کا کوئی حصہ ملتا ہے تو وہ بھی اسی ذات گرامی کے طفیل

حضرات! ہر طرف ناکہ بندی ہے، ساری راہیں مسدود اور سارے دریچے بند ہیں صرف اسلام کا راستہ ہے، اور صرف ایک دریچہ ہے، جسے اللہ تعالٰے نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے کھول رکھا ہے، ارشاد ہے:۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران ۱۹)

بلاشبہ دین (حق و مقبول) اللہ تعالٰے کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم عرب و عجم سب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں، اور اپنا علمی، عقلی، فکری، تہذیبی، اور اعتقادی سلسلہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں، ہر شخص نے آپ ہی کی شمع ہدایت سے کسب نور کیا ہے، اور ہر شخص آپ ہی کی دانش کا فیض یافتہ ہے، شاعر نے خوب کہا ہے ؎

یک چراغ است دریں بزم کہ از پرتو آن
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

امت اسلامیہ کے اندر جب تک اس حقیقت کا عرفان رہے گا، اور جب تک اس اصول کو وہ مضبوطی سے تھامے رہے گی، بے راہ نہیں ہو سکتی، اور نہ مصائب و مشکلات کا شکار ہو سکتی ہے۔

آخر میں آپ کے پرخلوص اعزاز، اور آپ کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے لئے ایمان کی تکمیل، اور اس کی حفاظت فرمائے، خاتمہ بالخیر ہو، اور قیامت کے روز ہمارا نام ان خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں ہو جن کے چہرے رکھتے ہوں گے

مسئلہ صرف دین و لادینیت کا ہے

قم میں رابطہ کے وفد کی پذیرائی ایران کے مشہور عالم علامہ شریعتمداری نے اپنے دولت کدہ پر کی، موصوف کے اشارہ و ایما سے ایک عالم شیخ سعید النعمانی نے ایک خیر مقدمی تقریر کی جس میں انھوں نے خیر مقدم کی تمہید کے بعد اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نے اب بھی اختلاف و انتشار کے سیاہ صفحات کو ہمیشہ کے لئے نہ لپیٹ دیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی، ہمیں اب اپنے سفر کا آغاز اسی طرح کرنا چاہئے جیسا کہ ہمارے سلف صالحین نے کیا تھا، اس راہ میں ہمیں غیر معمولی عزم و استقامت اور ایثار و قربانی سے کام لینا ہوگا، اس لئے کہ ہمارا سامنا ایسے دشمن سے ہے جو مسلک و مذہب اور شیعہ سنی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

شیخ سعید کی تقریر کے بعد راقم الحروف نے جو کچھ عرض کیا، اس تقریر کا خلاصہ

(ترجمہ مولوی نذرالحفیظ ندوی کے قلم سے ہے)

حضرات! ابھی ایک فاضل مقرر نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ مشہور اور تسلیم شدہ حقائق ہیں، اور ان میں کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار و افتراق سے بچنے اور اختلافات کو ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اصل سرچشمہ اور مرکز کی طرف رجوع کیا جائے، اس لئے کہ جب بھیڑوں کا ریوڑ انتشار پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے تو ان کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مرکز کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ بھیڑیا اس بکری کو اپنا لقمہ بناتا ہے جو اپنے ریوڑ سے علیحدہ ہو۔ اس لئے جنگل میں منتشر بھیڑوں کو بھیڑیوں کا لقمہ بننے سے بچانے کے لئے ان کے راعی و محافظ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اور اس کی سرکردگی و نگرانی میں اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنا ہوگا۔

حضرات! ہم ایک امت سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے نبی ایک ہیں، ہماری کتاب اور ہمارا قبلہ بھی ایک ہی ہے۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جب اپنے معاصرین اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط تحریر فرماتے تھے تو قرآن مجید کی یہ آسمانی تبلیغ اور حکیمانہ آیت تحریر فرماتے تھے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ	کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ	ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے یہ کہ بجز
إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ	اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ	کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں کوئی کسی
فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا	کو رب نہ قرار دے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پھر اگر وہ
مُسْلِمُونَ۔ (آل عمران۔ ۶۴)	روگردانی کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم تو اطاعت کرنے والے

اللہ تعالیٰ نے تفرقہ و انتشار، اختلاف و کمزوری اور ذلت و نکبت سے بچنے کے لئے اتحاد و اتفاق، طاقت و قوت اور عزت و سربلندی کا راستہ بتلایا ہے، اور اس کو انبیاء و رسول اور ان کے تابعین علماء کی ذمہ داری قرار دیا ہے، اور اس آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ	کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ	اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمادیں،
كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللّٰهِ	پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے
وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ	بن جاؤ۔ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن کہے گا کہ
تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ	تم لوگ اللہ والے بن جاؤ، بوجہ اس کے کہ تم
وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ	کتاب سکھلاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو،
وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ	اور نہ یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو
بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ۔	رب قرار دے لو کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلائے گا
(آل عمران ۷۹۔۸۰)	بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

میں اس بات سے مکمل اتفاق رائے کرتا ہوں کہ دشمن کسی دین و مذہب، گروہ اور جماعت اور قومیت کے درمیان امتیاز نہیں کرتا۔ اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ آج مذہب کا مقابلہ مذہب سے نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ اس وقت دین و لادینیت کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ درپیش ہے، اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ یا تو انسان خدا و رسول، آخرت غیبی حقائق اور رسول کے لائے ہوئے پیغام پر یقین رکھے اور نجات کو اسی دین پر منحصر سمجھے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے یا پھر ان تمام غیبی حقائق کا کھلا انکار کر دے

اور تمام مذاہب سے اعراض کرے۔

حضرات! اس وقت صرف دین و لادینیت کا مسئلہ ہے، اگر آپ چاہیں تو اس کو کمیونزم کا نام دے سکتے ہیں، ورنہ لادینیت تو کمیونزم سے زیادہ وسیع مفہوم پر حاوی ہے اس لئے کہ وہ تمام ادیان و مذاہب، غیبی حقائق، انبیاء کی تعلیمات اور تمام دینی و اخلاقی قدروں کی منکر و مخالف بلکہ ان کے خلاف صف آرا ہے، دوسری طرف انبیاء اور ان کے تابعین کا کیمپ ہے جس کے ہم ادنیٰ خادم اور رضا کار ہیں، اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم اور بے پایاں احسان سے ہمیں اس خدمت کے لئے مامور فرمایا ہے، اس میں ہماری کسی صلاحیت اور استحقاق کو دخل نہیں ہے، ہمارا فرض ہے کہ جو پرچم محمدی ہمارے ہاتھ میں ہے ہم اس کو ہمیشہ سربلند رکھیں، اور اس کے نیچے جمع ہو کر اتحاد و اتفاق سے اس دین کو تمام دنیا میں پھیلانے اور اس کو سربلند رکھنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں، کوششوں اور جد و جہد کو بروئے کار لائیں۔

مشرق و مغرب کے سنگم
لبنان میں

مترجم

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

اسلام کے داعیان اولین کے نقش قدم پر

افغانستان و ایران کے دورہ سے واپسی کے بعد پانچ ہفتے ہم نے بیت المقدس اور بیروت کے سائے میں گزارے، ان ایام نے ہم کو اس ناقابل انکار حقیقت پر ایک نیا یقین و اعتماد بخشا کہ اسلام ہی قوموں کو متحد کرنے، دلوں کو جوڑنے، مسائل کو سلجھانے اور قافلۂ حیات کی قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ نئے سفر کا نیا توشہ تھا جس سفر کا آغاز گہوارۂ اسلام اور دعوت اسلامی کے مرکز سے ہونے والا تھا اور جس کی منزل وہ ممالک تھے جو اولین مرحلے میں اسلام کی روشنی سے فیضیاب ہوئے، خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی دعوت کو اپنایا اور ساتویں صدی ہجری تک خلافت اسلامی کا مرکز بن کر اس کو سینے سے لگائے رہے۔ انھیں ممالک سے اسلام کے سیلاب نے شمال مغرب میں کوہ اطلس اور اندلس اور جنوب مشرق میں کوہ ہندوکش اور دریائے سندھ کی وادی کا رخ کیا، اور انھیں میں اسلامی علوم کا نشو و نما اور ارتقا ہوا، میری مراد ملک شام (جس میں موجودہ سوریا، فلسطین، لبنان، شرق اردن شامل ہیں) اور عراق سے ہے، یہ ایک قدرتی وحدت تھی جس کو اسلام کے مبلغین نے جزیرۃ العرب سے نکل کر انتخاب کیا تھا

ہم بھی انھیں کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے تھے اور انھیں کے راستہ پر گامزن تھے، بلاشبہ اگر وہ مبلغین نہ ہوتے، ان کا جادہ نہ ہوتا، ان کا ایمان و اخلاص نہ ہوتا، ان کی سچائی اور دیانت داری نہ ہوتی، ان کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی نہ ہوتی تو اس علاقہ میں یہ دین نہ پھیلتا جس کے نام پر ہم ملتے ہیں۔ نہ یہ اسلامی اخوت ہوتی جس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، نہ یہ قرآنی عربی زبان ہوتی جو عرب اور عجم کے لئے افہام و تفہیم اور تبادلۂ خیال کا وسیلہ ہے اور جس کو وہ اپنی نسلی زبانوں پر فوقیت دیتے ہیں، نہ ان ملکوں کا علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور فکر انسانی کی تاریخ میں کوئی ایسا نمایاں اور تعمیری کردار ہوتا جس کے بغیر انسانیت کی تاریخ نامکمل رہ جائے، نہ دمشق و بغداد ہوتے، نہ ولید و ہارون، نہ ابو تمام اور بحتری ہوتے نہ متنبی اور معری، نہ سیبویہ اور کسائی ہوتے نہ کوفہ و بصرہ نہ رصافہ و کرخ نہ ابو حنیفہ ہوتے نہ اوزاعی[1]، نہ ابو یزید بسطامی[2] نہ عبدالقادر جیلانی[3]، نہ مستنصریہ اور نہ نوریہ[4] اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو جزائے خیر دے، اسلام، عراق و شام، دین و عقیدہ، انسانیت تمدن اور علوم و فنون سب کی جانب سے۔

نئے وفد کی تشکیل

رابطہ کا وہ وفد جس نے افغانستان و ایران کا دورہ کیا تھا اور اسی کو لبنان، شرقِ اردن، سوریا اور عراق کا دورہ کرنا تھا، وہ دونوں سابق رفقاء، راقم سطور اور استاذ احمد محمد جمال پر مشتمل تھا، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اس وفد کے سکریٹری تھے، لیکن بعض

---

[1] امام ابو حنیفہ بغداد میں اور امام اوزاعی بیروت میں مدفون ہیں۔ [2] بسطام میں مدفون ہیں [3] بغداد میں زندگی گزاری اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہیں۔ [4] مدرسہ نظامیہ سے بھی پہلا بغداد میں تھا دوسرا دمشق میں۔

شدید مجبوریوں کی بنا پر مکہ میں ان کا قیام ضروری ہو گیا، تو رابطہ کے جنرل سکریٹری نے رابطہ میں اسلامی تنظیموں کے سکریٹری استاذ عبد اللہ باہبری کو وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے منتخب کیا، استاذ باہبری ایک ادیب تعلیم یافتہ اور خوش مزاج نوجوان ہیں، حال ہی میں شمالی افریقہ کے دورہ سے واپس آئے تھے جو سابق مفتی مصر شیخ حسنین محمد مخلوف، شیخ محمد محمود الصواف اور شیخ عبد اللہ انصاری کی رفاقت میں ہوا تھا، مگر اس کے باوجود انھوں نے مشغولیت کو راحت پر ترجیح دی، اس وفد کی رفاقت منظور کر لی اور وفد کی تمام ذمہ داریوں کو پوری دلچسپی، سرگرمی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

اپنی کمزوری صحت اور گوناگوں عوارض کے پیش نظر مجھے اس طویل سفر میں ایک ایسے رفیق کی ضرورت تھی، جو میرے مزاج و ضروریات سے واقف ہو، اس بنا پر رابطہ نے ایک نئے رفیق اور میرے ذاتی معاون کا اضافہ کر دیا، وہ تھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ادب عربی کے استاذ، پندرہ روزہ "الرائد" کے ایڈیٹر خواہر زادۂ عزیز مولوی محمد رابع حسنی ندوی کی جن کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی کو مکہ میں قیام کرنا پڑا، سفر کی مشکلات کی وجہ سے جن کا سامنا اس دور میں ہر شخص کو کرنا پڑتا ہے، ان کو ہندوستان سے سعودی عرب پہنچنے میں خاصی تاخیر ہوئی (اگرچہ جدید تہذیب کے شیدائیوں کا کہنا ہے کہ اس دور میں سفر بہت آسان ہو گیا ہے) اس بنا پر سفر مؤخر ہوتا گیا، آخر کار جمادی الثانیہ کے اواخر میں ممکن ہو سکا

بیروت میں

اتوار کے روز جمادی الثانیہ کی آخری تاریخ تھی (۲۹ جولائی ۱۹۷۳ء) عصر کے وقت

ہندوستانی وقت کے ۳ بجے سہ پہر ہم سعودی طیارہ پر سوار ہوئے ہم کو رخصت کرنے کے لئے رابطہ کے معاون جنرل سکریٹری استاذ سید محمد صفوت سقا امینی جدہ میں رابطہ کے دفتر کے انچارج استاذ خلیل الحلوانی، ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی جدہ میں ندوی گھرانے کے افراد اور دوسرے دوست احباب تشریف لائے تھے غروب آفتاب سے دو گھنٹے قبل ہم بیروت پہنچ گئے۔

ہوائی اڈہ پر دار الافتاء لبنان کے ناظم عمومی سید حسین قوتلی اور جمہوریہ لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد کے قائم مقام شیخ محمد علی الجوزو مفتی جبل لبنان نے ہمارا استقبال کیا، ان کے ساتھ سعودی سفارتخانہ کے (قائم مقام سفیر) چارج ڈی افیرس عبد المحسن سمان، لبنانی وزارت خارجہ کے ایک نمائندہ اور لبنان سے رابطہ عالم اسلامی کے رکن شیخ سعد یاسین بھی تھے، ہوائی اڈہ پر بیروت میں رابطہ کے نمائندہ استاذ عبد الحکیم عابدین[1] سے بھی ملاقات ہوئی۔

ہوائی اڈہ پر معلوم ہوا کہ شیخ حسن خالد مفتی لبنان نے پہلے سے جبل بحمدون پر ایک شاندار ہوٹل اور بیروت کے ایک ہوٹل کے چند کمرے ریزرو کرائے ہیں اور ہم کو اختیار ہے کہ جبل میں قیام کریں یا بیروت میں، موسم کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے جبل کو ترجیح دی، اسی سے ہم کو پتہ چلا کہ ہم مفتی لبنان کے مہمان ہیں، ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بحمدون روانہ ہو گئے جہاں شیپرڈ ہوٹل (SHEPERD) میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔

---

[1] استاذ عبد الحکیم عابدین اخوان المسلمین اور دعوت اسلامی کے حلقہ کی معروف شخصیت ہیں، ایک طویل مدت تک مصر میں اخوان کے ناظم رہے ہیں، امام حسن البنا شہید کے بہنوئی ہیں، بیک وقت ایک ادیب، شاعر، مقرر اور مدبر ہیں۔

اسلامی اداروں اور بیروت کے مختلف علاقوں کا دورہ

دوسرے روز دوشنبہ یکم رجب ۱۳۹۳ھ (۳۰ر جولائی ۱۹۷۳ء) کو ہم نے مفتی لبنان شیخ حسن خالد سے ان کے دفتر میں افتاء کے ناظم عمومی سید حسین قوتلی کی موجودگی میں ملاقات کی۔ لبنان میں مسلمانوں کے حالات، اسلامی اداروں کے ساتھ مادی اور اخلاقی تعاون کی ضرورت اور ان خطرات کے موضوع پر جن میں لبنانی مسلمان گھرے ہوئے ہیں، مفتی صاحب نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک وفد کے ساتھ بہت صفائی سے گفتگو کی۔ پھر مفتی صاحب ہی کی معیت میں وفد ایک معلوماتی دورہ پر روانہ ہوا، جس کی پہلی منزل بیروت کی وہ دینی تعلیم گاہ تھی جس کا نام ازہر لبنان ہے۔ وفد نے ادارہ کے کتب خانہ اور اس کے مختلف شعبوں کا معاینہ کیا۔ موسم گرما کی تعطیل ہو چکی تھی، کتب خانہ کے ہال میں کچھ ریسرچ اسکالر اپنی تحقیق اور ریسرچ میں مصروف تھے۔ وفد کے ساتھ ازہر لبنان کے ناظم شیخ خلیل بھی تھے۔ پھر وفد نے بیروت کے اسلامی یتیم خانہ کا رخ کیا، جہاں یتیم خانہ کے ناظم استاذ محمد برکات نے وفد کا استقبال کیا۔ وفد کو یتیم خانہ دکھایا اور اس کے مقاصد اور سرگرمیوں کی وضاحت کی۔ ہر چیز نظافت اور توجہ و شائستگی کا پتہ دے رہی تھی، اور یتیم بچوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کو اپنی ذلت و کمتری کے احساس سے بچانے کے لئے نفسیاتی طریقے اختیار کئے گئے تھے۔

شہر کے مختلف حصوں سے ہمارا گزر ہوا، بہت سے علاقوں کی دینی، اقتصادی اور اجتماعی سطح اور معیار ایک دوسرے سے بہت مختلف نظر آتا تھا۔ ساحل سمندر کی سیر کرتے ہوئے جب ہم اس علاقہ کی طرف جا رہے تھے جو امام اوزاعی کے مدفن ہونے کی وجہ سے انھیں کے نام سے موسوم ہے، ہم فدائین کے مرکز سے گزرے، جہاں لبنانی فوج اور فدائین کے

درمیان معرکہ کارزار گرم ہوا تھا، اور ہم نے دیکھا کہ کس طرح مختلف مذہبی جذبات اور سیاسی اغراض نے اس معرکہ میں حصہ لیا تھا، اور ملک کی زندگی اور مختلف عناصر کے باہمی تعلقات پر کس طرح یہ جنگ اثرانداز ہوئی تھی، عمارتوں اور ملک کے باشندوں کے دلوں میں گولیوں اور بموں کے اثرات کا مشاہدہ کیا، نیز پناہ گزینوں اور فلسطین کا مسئلہ جس پیچیدگی، ابہام اور تضاد کا شکار ہے جس کی نظیر موجودہ دنیا کے دوسرے مسائل میں ملنی مشکل ہے، اس کو سمجھنے میں مدد ملی۔

اس علاقہ سے بھی ہمارا گزر ہوا جہاں فلسطینی پناہ گزیں رہتے ہیں، اس علاقہ میں افلاس، پسماندگی، گندگی، اپنے مستقبل کی طرف سے مایوسی، بے اعتمادی اور موجودہ حالات سے برگشتگی عام ہے، یہ تمام چیزیں اسی ملک کے لئے نہیں بلکہ پوری عرب دنیا کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ صورت حال ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی، خواہ اس کے دور کرنے میں کتنا ہی وقت لگے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کیسی ہی کوشش کی جائے۔

دوسری طرف پورا ملک زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور ہر جگہ دولت کی ریل پیل ہے۔

بیروت پر ایک نظر

لبنان کے مشہور شہروں اور اسلامی مرکزوں، طرابلس اور صیدا کا رخ کرنے سے پہلے جو ہمارے دورہ کے پروگرام میں شامل تھے، ہم بیروت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں، بیروت جو مشرق عربی کے لوگوں کا محبوب شہر اور تفریح گاہ ہے، جہاں وہ موسم گرما گزارتے ہیں اور جہاں ان کی دولت کا دریا امنڈتا نظر آتا ہے، عظیم عربی شاعر ابو تمام طائی کا

یہ قول بیروت پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

دنیا معاش للفتی حتی اذا
حل الربیع فانما ھی منظر

ترجمہ:- دنیا آدمی کے لئے کمانے کی جگہ ہے، مگر جب بہار آتی ہے تو تفریح گاہ،
بس تفریح گاہ ہے۔

بیروت ایک عظیم تجارتی مرکز ہے، مگر موسم گرما میں وہ صرف دل بہلانے کی جگہ اور نزہت گاہ ہے اگر کوئی شخص اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے کہ مغربی تہذیب اور مادی نظریوں نے کس طرح عربوں کی فطرت مسخ کر دی ہے، اور عرب کس حد تک عیش پسند اور ساری حدود و قیود ــ خواہ مذہب و شریعت کے عائد کردہ ہوں، یا روایات اور عام انسانی اقدار کی ــ سے آزاد ہو چکے ہیں، اور عرب دارالحکومتوں میں خرید و فروخت اور افراط زر کی سطح کیا ہے تو اس کو بیروت جانا چاہئے، اور لبنان میں موسم گرما گزارنے کے مقامات پر کچھ ایام گزارنے چاہئیں، اتفاق سے ہمارا دورہ گرمی کے سخت دنوں میں تھا جب بیروت کی رعنائی اور دلکشی عروج پر تھی، اس سے پہلے بھی گرمی اور سردی کا دونوں موسموں میں متعدد بار بیروت آنے کا موقع ملا تھا، مگر خاص مقصد کے تحت آنا ہوتا تھا جس کی وجہ سے نشر و اشاعت کے مرکزوں، کتاب گھروں اور بعض اسلامی اداروں سے زیادہ کچھ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن اس آخری دورے میں اس شہر کے حالات و خصوصیات کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا۔

مشہور لبنانی ادیب امین الریحانی[1] نے اپنے ایک مضمون میں بیروت کا بہترین نقشہ

---

[1] امین الریحانی ایک مشہور صاحب طرز لبنانی ادیب تھے جن کی کتابیں اور مقالات اس (باقی صفحہ پر)

کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بیروت تمدن کی ایک نعمت بھی ہے اور تمدن کی ایک لعنت بھی۔ بیروت ایک مشرقی دولہن ہے جو تہذیب کے مغربی خلعت میں لپٹا ہوا ہے۔ صبح کے وقت ملکۂ مشرق کے پاؤں کا پازیب اور غروب کے وقت ملکۂ مغرب کی کلائی کا کنگن۔ بیروت کیچڑ میں پڑا ہوا ایک دُرِّ نایاب ہے جس پر بجلی کی کرنیں شرماتی ہوئی پڑتی ہیں۔ بیروت ایک مرجان ہے، جو ایک ایسے ساحل پر ہے جس کا سونا ریت ہیں اور جس کی چاندی کیچڑ میں مل گئی ہے۔

بیروت پیرس کی ایک کنیز ہے، بیروت ایک ماہتاب ہے جس پر مغرب کی روشنی منعکس ہوتی ہے تو مشرق کو منور کرتی ہے اور مغرب کی تاریکی بھی منعکس ہوتی ہے، جو مشرق کی تاریکی میں اضافہ کرتی ہے۔ بیروت علوم کا سرچشمہ اور خرافات کا گڑھ ہے۔"[1]

یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ مضمون آج سے ۶۲ سال پہلے لکھا گیا تھا جب پورا شام عثمانیہ سلطنت میں شامل تھا اور یہ معلوم ہے کہ لبنان اور اس کے دارالحکومت بیروت پر چوتھائی صدی تک فرانس حکمران رہا ہے۔ فرانس یورپ کے ملکوں میں سب سے متمدن اور ترقی یافتہ ملک، اور فرانسیسی معاشرہ یورپ کا سب سے زیادہ نازک مزاج، تنعم پسند اور ہر چیز میں آزادی کا دلدادہ رہا ہے۔ پھر جب آزادی کا دور آیا تو خرابیوں میں اور اضافہ ہو گیا

(زکی [illegible] تا [illegible]) صدی کی پہلی چوتھائی میں بہت مشہور تھے۔ اکثر ترک کر دیے [illegible] ان کے دو مستند تصنیفات تھے۔ جنہوں نے ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔

[1] مجلہ المراقب جلد ۳ شمارہ ۲۰ ، ۲ مئی ۱۹۱۳ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ

ان تمام اسباب کی بنا پر بیروت کو مغربی تہذیب کی تقلید اور پیروکاری میں سب سے نمایاں درجہ حاصل ہے۔

اپنے سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفادات کے ماتحت امریکہ نے اس شہر میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کی پوری کوشش کی اس لئے کہ بیروت مشرق کا دروازہ، عالم عربی کا قلب تپندہ اور وہ تنہا عربی شہر ہے، جس پر عیسائی چھاپ گہری ہے، چنانچہ امریکہ نے بیروت میں جیسے بڑے ادارے قائم کئے، زبردست منصوبے تیار کئے اور ان کو تکمیل کا جامہ پہنایا، بیروت کی امریکن یونیورسٹی (الجامعة الامریکیة) آج بھی مشرق عربی کی عظیم ترین یونیورسٹی تصور کی جاتی ہے جس نے عربی فکر و ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے، اور عرب کے علمی حلقوں میں اس کے اساتذہ اور فضلاء کو خاص رسوخ حاصل ہے۔

بیروت مشرق عربی کا سب سے بڑا سیاحتی شہر ہے، سیاحت اس کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ ہے جس پر اس کی معاشیات کا بڑی حد تک دار و مدار ہے، سیاحتی شہروں کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ان شہروں میں تفریح اور لذت اندوزی کے لئے ہر طرح کی چھوٹ دے دی جاتی ہے، اور ان چیزوں میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا جو اکثر معاشروں میں انسانیت اور شرافت کے منافی شمار ہوتی ہیں، چنانچہ جس وقت عرب راجدھانیاں بادِ سموم کے تھپیڑوں کی لپیٹ میں ہوتی ہیں، بیروت رعنائی و جمال کے سمندر میں غرق اور دولت و ثروت کے جھولے میں جھولتا ہوتا ہے۔

متعدد عرب ملکوں میں فوجی اور سیاسی انقلابات رونما ہوئے اور بہت سے زعماء اور مصلحین پر زمین تنگ ہو گئی تو انھوں نے لبنان میں پناہ لی، اس لحاظ سے لبنان کو عالم عربی کا سوئزرلینڈ کہہ سکتے ہیں، جہاں سیاسی پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد مقیم ہے، اور انھیں

تصنیف وتالیف اور اپنے خیالات کی تبلیغ واشاعت کی مکمل آزادی حاصل ہے جو بہت سے عربی ملکوں میں اور خود ان کے اپنے وطن میں بھی ناپید ہے۔ انھوں نے اپنی جائدادیں بیروت منتقل کرلیں اور ان کو کاروبار میں لگایا۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے نشر واشاعت کا میدان ان کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ اس لئے اپنا سرمایہ اسی میدان میں لگایا۔ بیروت میں مشرق کے ...... زبردست عربی پریس تھے۔ اس بنا پر ان دماغوں کا کام کرنے والے ہاتھوں اور اس کی ہجرت کے منتقل ہونے سے بیروت کو خاصا فائدہ ہوا اور تصنیف وتالیف کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں کتب خانوں اور کتاب گھروں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا۔ مصنفین نے ہر سمت سے اس کا رخ کیا خصوصاً جب قاہرہ میں تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا بازار سرد پڑ گیا آخر میں اس پر پابندی عائد کی گئی تو بیروت نشر واشاعت اور کتابوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

یہ بیروت پر ایک طائرانہ نظر ہے۔ طرابلس اور صیدا کے دورے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لبنان پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔

طرابلس میں

۲ رجب ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۳ر جولائی ۱۹۷۲ء دوشنبہ کے روز ہم نے طرابلس کا رخ کیا طرابلس ایک حسین وجمیل اسلامی شہر ہے۔ بیروت سے ۸۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر آباد ہے۔ راقم سطور کو اس سے پہلے بھی ایک بار شعبان ۱۳۷۵ھ مطابق اپریل ۱۹۵۶ء میں طرابلس کے مختصر دورہ کا موقع ملا تھا اور طرابلس اسے بہت پسند آیا تھا۔ تمنا تھی کہ دوبارہ طرابلس جانے اور وہاں کچھ دن گزارنے کا موقع ملے خدا کا شکر ہے کہ ۱۶ سال بعد یہ موقع ہاتھ آیا۔ اور ہم دوشنبہ کی صبح کو استاذ حسین القوتلی کے ساتھ طرابلس روانہ ہوگئے۔ ہم سمندر کے ساحل پر چل رہے تھے

یہ راستہ ہمارے خیال میں مشرق کا خوبصورت ترین راستہ ہے، بحیرۂ روم ہمارے بائیں ہاتھ رواں تھا اور بہت کم ہم سے جدا ہوتا تھا، صاف ستھری اور خوبصورت بستیوں اور دلکش و دل آویز مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم سرگرم سفر تھے۔

طرابلس پہنچے تو علماء شہر کی ایک جماعت اور محکمۂ قضا و افتاء کے متعلقین نے ہمارا استقبال کیا، سب سے پہلے ہم محکمۂ اوقاف کے صدر دفتر گئے اور اس عظیم مسجد کی زیارت کی جو ابھی تعمیر و تکمیل کے مراحل میں ہے، پھر اسلامی یتیم خانہ اور اسلامی شفاخانہ دیکھنے گئے، شفاخانہ کی مجلس انتظامیہ کے صدر شیخ عدنان الجسر نے ہم کو شفاخانہ کی عالی شان عمارت دکھائی جس کی ترتیب و تنظیم جدید طریقہ پر کی گئی ہے، وفد نے صدر کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ نرسوں کو اسلامی لباس اور اسلامی آداب کا پابند ہونا ضروری قرار دیا جائے تاکہ یہ تمام اسلامی شفاخانوں کا شعار اور ان کی خصوصیت بن جائے، ان سب اداروں میں عمدہ ذوق، باقاعدگی اور خوش سلیقگی نمایاں تھی جس کے لئے طرابلس مشہور ہے۔

پھر مدرسۃ الایمان دیکھنے گئے جو ایک بامقصد مدرسہ ہے، وہاں اتفاق سے مولوی صبغۃ اللہ مجددی سے ملاقات ہوئی جن سے کابل میں ہم مل چکے تھے، وہ لیبیا کی ثقافتی کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے اور کابل واپس جا رہے تھے کہ اچانک ہوائی اڈہ پر افغانستان کے انقلاب کی خبر سنی تو سفر ملتوی کر دیا، اور صورت حال واضح ہونے تک لبنان ہی میں مقیم رہنے کا فیصلہ کیا۔

پھر وفد طرابلس کے عظیم عالم شیخ ندیم الجسر کی ملاقات کے لئے گیا جو طرابلس کے نامور اور جلیل القدر عالم شیخ حسین الجسر مصنف "الرسالۃ الحمیدیہ" کے فرزند ہیں، میں شیخ کی ایک کتاب "قصۃ الایمان بین الفلسفۃ والعلم والقرآن" پڑھ چکا تھا اور جب ہم

میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ پُر مغز اور محقق کتاب یہی نظر آئی ، ہم برصغیر کے باشندوں نے علامۂ شام شیخ حسین الجسر طرابلسی کو ان کی کتاب "الرسالۃ الحمیدیۃ" کے ذریعہ جانا تھا ، جس کو اس صدی ہجری کے آغاز میں بہت مقبولیت و شہرت حاصل تھی ، ہندوستان کے علماء اس کتاب کو بہت پسند کرتے تھے ، ان کے نزدیک یہ کتاب مذہب اور اسلامی عقائد کا زبردست علمی دفاع ہے ، شیخ ندیم الجسر انہی کے فرزند ان کے علم کے وارث اور طرابلس کے مفتی ہیں ۔

ہمارا قافلہ سیر کی طرف روانہ ہوا جو لبنان میں گرمی گزارنے کا ایک دلکش مقام ہے وہ سطح سمندر سے .. میٹر بلند ہے ، شیخ ندیم الجسر یہیں مقیم ہیں ، یہاں شیخ کے دولت خانہ پر دیر تک نشست رہی ، شیخ کی گفتگو کا موضوع وہ زیر تجویز فلم تھی جس میں سیرت نبوی کے واقعات اور صحابہ کرام کو دکھایا جائے گا ، اور جس کی بعض عرب ملکوں نے منظوری دے دی ہے اس بدعت سے وہ بہت متفکر اور پریشان نظر آتے تھے ، ان کا خیال ہے کہ ضعیف احادیث اور سیرت و تفسیر کی وہ کتابیں جو سند و تحقیق کے اعلیٰ معیار پر نہیں ہیں ، مستشرقین اور اسلام کے دشمنوں کے لئے بہترین مواد فراہم کریں گی جس کو وہ سیرت کا حسن بگاڑنے اور سیرت کو رومانی افسانوں کے روپ اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے افسانوی اسلوب میں پیش کرنے کے لئے استعمال کریں گے اور پھر اس پر پابندی لگانا ناممکن ہو جائے گا

طرابلس میں میری تقریر

دوپہر کا کھانا ہم نے سیر میں مفتی صاحب طرابلس کی ضیافت میں کھایا ، علماء کی ایک بڑی جماعت شریک تھی ، کھانے کے بعد وفد کے خیر مقدم اور تعارف میں ایک تقریر کی گئی

راقم سطور نے اس خیر مقدمی تقریر کا جواب دیا اور اہل طرابلس کی کریمانہ ضیافت اور گرمجوشی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

> "لبنان کے مسلم عوام ایک مخصوص اور نازک صورت حال سے دوچار ہیں جس میں ان کی ذہانت، قوت ارادی اور عقیدہ کی پختگی کا امتحان ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کی نصرت پر، پھر اپنے دین کی صلاحیت اور اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے لبنان کے مسلمانوں کو اس کار عظیم کا اہل سمجھا اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے منتخب فرمایا، یہ پریشان ہونے اور گھبرانے کا موقع نہیں، صبر و شکر کا موقع ہے، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو کبھی اپنی نصرت و حمایت سے محروم نہیں کرے گا جس کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں ان اسلامی اداروں کی شکل میں جلوہ گر ہیں، جن کو دیکھنے اور جن سے واقفیت حاصل کرنے کا شرف ہم کو حاصل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی مدد کرتا ہے جو کوشش کرتا ہے، دوڑ دھوپ کرتا ہے، زندہ رہنے کا استحقاق ثابت کرتا ہے، اور وہ دشواریوں اور آزمائشوں میں بھی اپنا راستہ نکال لیتا ہے۔"

ملاقات اور تعارف

طرابلس کے دورہ کے اثنا میں وفد نے چند علماء سے ملاقات کی، جن میں استاد جمیل مولوی، شیخ محمد صالح بونجی، شیخ رشید میقاتی، استاذ محمد علی ضناوی اور شیخ ناصر الصالح قابل ذکر ہیں، ان حضرات کے ساتھ مختلف اسلامی و مذہبی موضوعات اور ملک کے سیاسی و اجتماعی حالات

گفتگو رہی اور وفد کو ان کی معلومات اور افکار و خیالات سے استفادہ کا موقع ملا۔ اس دورہ سے وفد کو بہت مسرت ہوئی اور وہ ان حضرات کا بہت مشکور تھا جنھوں نے اس کا استقبال کیا اور ملاقات، تعارف اور تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کیا۔ اس کے بعد وفد بحمدون واپس آگیا۔

صیدا میں

۳ رجب ۱۳۹۳ھ مطابق یکم اگست ۱۹۷۳ء چہار شنبہ کی صبح کو وفد نے لبنانی شہر "صیدا" کا رخ کیا جو اپنی آبادی اور مرکزیت کے لحاظ سے لبنان میں تیسرے نمبر کا شہر ہے۔ وفد کے ساتھ ازہر لبنان کے ناظم شیخ خلیل کبی بھی تھے۔ راستہ بہت حسین اور سفر بڑا دلچسپ اور فرحت بخش تھا۔ صاف ستھرے اور دلکش لبنانی شہروں اور دیہاتوں سے گزرتے ہوئے ہم صیدا پہنچے جو بیروت سے ۴۳ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔

صیدا پہنچنے کے فوراً بعد وہاں کے محکمۂ اوقاف کے مقامی دفتر گئے اور کچھ دیر نشست رہی۔ اس موقع پر متعدد دینی شخصیتیں اور علماء موجود تھے۔ پھر وفد اوقاف کے فاضل مدیر سلیم سوسان کے ساتھ صیدا کے مفتی شیخ محمد انیس حمود کی ملاقات کے لئے گیا۔ ملاقات بہت خوشگوار تھی۔ استقبالیہ کمرہ میں دیر تک ہم لوگ بیٹھے رہے، گفتگو ہوتی رہی، اور پھر ایک مذاکرہ کا آغاز ہوا جس کا موضوع تھا "مسلمانوں کے اہم مسائل اور وہ عجیب افسوسناک صورت حال جس سے اس دور کا مسلمان دوچار ہے" اور اس سے پہلے کی تاریخ میں جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ہر شخص نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ راقم سطور کی باری آئی، اس کی معروضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

قوم میں علماء کا منصب و مقام اور عوام میں ان کے بے اثر ہونے کے اسباب

یہ گفتگو کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر ہم عالم اسلامی کے تمام طبقوں اور حلقوں کا جائزہ لیں گے اور اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہونے میں ان کی کوتاہی اور بے توجہی پر گفتگو کریں گے تو کچھ حاصل نہ ہوگا، اور کسی نتیجہ تک رسائی مشکل ہوگی۔

تنہا وفور غم ذات خود فریب کیا کیا نہ ہم

اس لئے ہم اپنی گفتگو کو علماء کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں تک محدود رکھیں گے یہ گفتگو مفید بھی ہے، اور عملی بھی، اس لئے کہ اس وقت بھی حضرات علماء ہی تشریف رکھتے ہیں، اور ہمارا روئے سخن انہیں کی طرف ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اصلاح اور درستگی کا دار و مدار علماء کی اصلاح و درستگی پر ہے، علماء اگر صحیح راستہ پر ہوں گے تو قوم بھی صحیح راستہ پر ہوگی، اور اگر علماء میں انحراف ہوگا، بے یقینی اور کمزوری ہوگی، اگر ان کے اندر مادی خواہشات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور حالات کے سامنے جھکنے کا رجحان ہوگا، ان کا معیار زندگی بلند ہوگا، ان کے اندر سادگی اور قناعت کا فقدان ہوگا، وہ تنعم پسندی اور راحت طلبی کے عادی ہوں گے تو اس کا اثر لازمی طور پر مسلم عوام پر بھی پڑے گا، اسی موقع کے لئے کسی شاعر نے کہا تھا۔

مژدہ باد اے مرگ | عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر ایسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی، پہلے اسلامی معاشرہ علماء کا ادب کرتا تھا، اور ان کو

بڑے احترام اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جب یہ زہد و قناعت، بے نیازی و بلند نفسی، بلندی کی قدر، تقشف و سادگی سے مالا مال تھے، یہاں تک کہ سلاطین و امراء ان سے ڈرتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے، اور ان کو اپنے سے بلند سمجھتے تھے۔

لیکن آج علماء کا یہ حال ہے کہ وہ بھی راحت طلبی کی دوڑ میں سب کے ساتھ مصروف ہیں، اور اب ان کے درمیان اور ان کے ہم وطن و ہم نسل افراد کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا، معاشرہ بھی انہیں اسی نگاہ سے دیکھنے لگا جس نگاہ سے وہ عوام کو دیکھتا ہے، اور اب لوگوں کے دلوں میں علماء کی کسی نصیحت یا تنقید کی وقعت نہیں پیدا ہوتی۔

دعوت و تبلیغ کے لئے نہایت ضروری ہے کہ علماء اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کریں، اپنا اعتبار اور اپنی دینی اور اجتماعی قیمت کا شعور پیدا کریں، اصلاح و تجدید کی تاریخ میں ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی اسلام اور مسلمان کسی شدید بحران سے دوچار ہوئے ہیں، ہر طرف ناامیدی اور بے یقینی کے بادل چھا گئے ہیں، ایک عالم نمودار ہوا، اصلاح و جہاد کے میدان میں آیا۔ حالات کو چیلنج کیا اور تاریخ و واقعات کا رخ موڑ کر رکھ دیا، اسلامی عقائد کی سلامتی اور اسلامی شریعت کی عظمت کے تحفظ کا فرض انجام دیا، قوم کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے ایک نئی زندگی بخش دی، یہ عمل ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں۔ امام حسن بصری سے شیخ عبدالقادر جیلانی تک، ابن تیمیہ حرانی تک، شیخ احمد سرہندی تک اور اسی صدی کے علماء ربانیین اور ائمہ مصلحین تک ہر زمانہ اور ہر ملک میں

یہ ہوتا آیا ہے، اور تبھی سے کہ اس دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تزکیہ کے سلسلہ کو جاری رہنا چاہیے۔

اکثر حاضرین نے اس نکتہ کو تسلیم کیا اور اس کی تائید کی۔

صیدا کا دورہ

پھر ہم "جمعیۃ رعایۃ الیتیم" دیکھنے گئے جو ایک مسلم یتیم خانہ چلاتی ہے، یہ ایک وسیع و کشادہ عمارت ہے، کئی شعبے اور متعدد دالان ہیں، اس کے منتظمین اور قائم کرنے والوں نے اس کی تعمیر و تزئین میں بہت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے، اور تمام تکلفات کا لحاظ رکھا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ موجودہ دور کے جدید ترین طرز کے فلاحی اداروں سے کسی طرح سے کم نہیں ہے، اور منتظمین نے اس ادارہ کو "ترقی یافتہ" بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، انھوں نے بعض ایسی سرگرمیاں بھی داخل کر دی ہیں، جو اسلامی شریعت و آداب کے خلاف ہیں، چنانچہ اس ادارہ کے متعلق ایک کتابچہ میں ایک تصویر ہے جس میں اس کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقامی رقص کی حالت میں دکھایا گیا ہے، طالبات کو خیاطی اور دوسری دستی صنعتوں کے سکھائے جانے پر خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ہم صیدا کے قاضی شریعت شیخ سلیم جلال الدین کے گھر گئے جو ایک خوبصورت ٹیلہ پر واقع ہے، یہ ٹیلہ کھیتوں اور باغات سے گھرا ہوا ہے، اس کے سامنے ایک وادی ہے، جس میں سرو قامت درخت کھڑے ہیں اور رنگ برنگ کے پھولوں اور کلیوں سے بھری ہوئی ہے، اس وادی کا حسن اور ٹیلہ کا قدرتی محل وقوع بہت لطف دے رہا تھا، وہاں علماء اور دوسرے احباب سے ملاقات اور گفتگو رہی اور مناظر قدرت کے ساتھ ساتھ شیریں گفتار، حسن اخلاق اور

شرافت نفس کے جلوے دل و نگاہ کو مسحور کر رہے تھے۔

پھر وفد نے سمندر کا تاریخی قلعہ دیکھا اور ساحل سمندر پر ایک شاندار ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور مسرور و محظوظ بیروت واپس آ گیا۔

مفتی امین الحسینی کی میزبانی

اسی روز شام کو مؤتمر عالم اسلامی اور الہیئۃ العربیۃ العلیا لفلسطین کے صدر مفتی امین الحسینی[1] نے وفد کے اعزاز میں منصوریۃ المتن میں اپنے دولت خانہ پر ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا جس میں علماء، عمائدین شہر اور تحریک اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک تعداد شریک تھی۔

لبنانی مسلمانوں کی صورت حال پر ایک نظر

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم لبنانی مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی صورت حال پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ یہ ایک پیچیدہ اور مخصوص صورت حال ہے جس کا اندازہ دوسرے ملکوں کے باخبر سیاستداں بھی آسانی سے نہیں لگا سکتے۔ جس شخص نے لبنان کا دورہ نہ کیا ہو اور وہاں کے حالات پر دقت نظر سے غور کرنے کا موقع اس کو نہ ملا ہو تو وہ اس صورت حال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

مختصر یہ کہ لبنان کے مسلمان دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں خصوصاً شامیوں کی بغاوت، اتحادیوں کے وعدوں پر اعتماد اور خلافت عثمانیہ کے دائرے سے خروج کی سزا اور شکست سے ابھی تک عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں، وہ خلافت عثمانیہ جو اپنی تمام غلطیوں، کوتاہیوں اور

---

[1] افسوس کہ [illegible] مفتی صاحب [illegible]

کمزوریوں کے باوجود اسلامی قوت اور اسلامی اتحاد کا نشان اور مقامات مقدسہ کی محافظ تھی غالباً اس تاوان میں جو عربوں کو ادا کرنا پڑا ہے، اور آج بھی ادا کر رہے ہیں، لبنان کے مسلمانوں کا حصہ شام کے دوسرے باشندوں سے زیادہ ہے۔ لبنانی مسلمان آج بھی اس پیچیدہ نقشہ کا اور نرالی صورت حال کے دباؤ سے کراہ رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جبل لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی، اس کے برخلاف ساحل اور بقاع میں مسلمان اکثریت میں تھے، پھر ۱۹۲۰ء میں بیروت، صیدا، جبلبک، بقاع، حاصبیا اور راشیا کا لبنان سے الحاق عمل میں آیا، اور جبل لبنان کو نئی جمہوریہ کی اساس و بنیاد قرار دیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں فرانسیسی حکومت نے مردم شماری کرائی جو ۳۱ جنوری ۱۹۳۲ء کو عمل میں آئی، اس مردم شماری کے پیچھے سیاسی اغراض کارفرما تھے، دراصل فرانس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے باشندوں کی تعداد میں ایک فرقہ کو دوسرے پر فوقیت دے دی جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک افواہ یہ بھی پھیل گئی کہ فرانس کا مقصد اپنی نوآبادیات میں فرانسیسی فوج میں جنگ کے لئے جبری بھرتی ہے، اور مسلمان اس سے بچتے تھے، مسئلہ کی پیچیدگی میں اس سے اور اضافہ ہو گیا کہ وہ صوبوں کی تقسیم کے مخالف تھے۔

ان تمام اسباب کی بنا پر مسلمانوں نے مردم شماری سے کلی فرار اختیار کیا، نتیجہ ظاہر تھا چنانچہ اس پرفریب مردم شماری سے عیسائیوں کی اکثریت ثابت ہو گئی، لبنان کے اعلیٰ حکام نے دوسری صحیح اور مکمل مردم شماری کرانے سے انکار کر دیا، اور آج بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہیں، جبکہ پہلی مردم شماری پر چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔

اسی مردم شماری کی بنیاد پر قومی دستور مرتب کیا گیا، اعلیٰ عہدوں اور پارلیمنٹ کی نشستوں کی تقسیم انجام پائی اور یہیں سے اس عرب اسلامی ملک میں مسلمانوں کی حیثیت اور مستقبل کا تعین ہوا

اور وہ یہ کہ مسلمان تعداد میں اکثریت کے باوجود اپنے وطن میں اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزاریں گے۔ معاملہ کی سنگینی اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ غیر مسلموں کو لبنانی قومیت پوری کی بنیادی سے دی جاتی ہے اور اس طرح ان کے سیاسی مستقبل کا تحفظ کیا جارہا ہے۔

فرانس جب لبنان کو چھوڑ رہا تھا تو اس نے حکومت مارونی فرقہ کے سپرد کی ایک ایسا دستور (CONSTITUTION) وضع کیا گیا جس کے رو سے ساری طاقت صدر جمہوریہ کے قبضہ میں ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ عیسائی ہوتا ہے، اس کو سب سے زیادہ اختیارات دئیے گئے ہیں، وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوتا، اور وزیر اعظم کو جس کے متعلق دستور میں ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں سے منتخب کیا جائے گا، صدر جمہوریہ ہی مقرر کرتا ہے، وزیر اعظم پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، اور پارلیمنٹ جب چاہے اس کے خلاف اور اس کے وزراء کے خلاف............... عدم اعتماد کی تجویز پاس کر سکتی ہے، وزیر اعظم کے پاس مخصوص اختیارات بھی کچھ نہیں ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ صدر جمہوریہ کا ہیڈ کلرک ہوتا ہے اگرچہ عملی طور پہ عزت مآب صدر جمہوریہ کا محافظ اور ڈھال ہوتا ہے۔

یہ تو وہ دستور ہے، جو تحریری شکل میں ہے اور جو لبنانی مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتا، اس کے علاوہ وہاں ایک اور دستور بھی ہے، جو کسی تحریری شکل میں نہیں ہے، وہ ہے وہ طریقہ جس کو لبنانی جمہوریہ اپنائے ہوئے ہے، ان دونوں دستوروں میں نمایاں تضاد پایا جاتا ہے، چنانچہ کلیدی عہدوں پر غیر مسلموں کی اجارہ داری ہے، ترقیاتی پروگراموں، مدارس، ادارے اور وظائف وغیرہ کے مستحق صرف غیر مسلم طلبے ہوتے ہیں، اخلاقی اقدار سے انحراف اور یکساں سول کوڈ کی دعوت مزید برآں جس کی اس ملک کی زندگی میں بہت اہمیت ہے، تعطیل کے ایام حکومت نے جمعہ کے بجائے سنیچر اور اتوار کو مقرر کیا ہے، حکومت

کی سفارشات میں سے ہے کہ ملازمت کی بنیاد فرقہ وارانہ ہو۔ ان اسلامی علاقوں کو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جاتا ہے، اسی طرح جن مسلمانوں نے کسی وجہ سے لبنان چھوڑ دیا تھا، ان کو لبنانی قومیت حاصل کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے[1]

بلاشبہ اس صورت حال کی ذمہ داری لبنانی مسلمانوں پر بھی ہے اور بہت سی چیزوں کا تعلق ان کی کوتاہیوں اور معاملات کا صحیح اندازہ نہ لگانے سے ہے کیونکہ لبنان کے سارے معاملات غیر مسلموں کی جانب سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق رونما ہوئے، اس کے برعکس مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کسی منصوبہ بندی سے کام نہیں لیا، ایک سبب مسلم پارٹیوں کے لیڈروں کی انانیت اور سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی اور نفس پرستی بھی ہے، جو ہر قیمت پر وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو قبول کرتے رہے خواہ اس سلسلہ میں لبنان کے مسلمانوں کے مفادات اور مصالح کو قربان ہی کرنا کیوں نہ پڑے۔ ان لیڈروں نے کبھی لبنانی مسلمانوں کے ساتھ مساوات اور ان کے فطری اور شہری حقوق کا مطالبہ نہیں کیا اور بعض اوقات وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو قبول کر لینے کے لئے "عزت مآب صدر" کی دعوت پر فوراً لبیک کہا، خواہ اس کی مدت چند ہفتوں اور چند دنوں سے زیادہ نہ ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لبنان کے مسلمان عرب حکومتوں اور عرب دنیا سے بالکل علیحدہ اور الگ تھلگ رہتے ہیں، ان کو کسی عرب حکومت سے کوئی تعاون اور اپنے مسائل کے سلسلہ میں کسی قسم کی ہمدردی حاصل نہیں ہوتی، اس کے برخلاف عیسائی فرقہ کو تمام عیسائی یورپین قوموں، امریکا اور ویٹیکن سے ہر طرح کا تعاون ملتا ہے۔ پوری عیسائی دنیا اس کی

---

[1] یہ حصہ استاذ محمد علی الضناوی الہامی کی کتاب "المسلمون فی لبنان مواطنون لا رعایا" کے مطالب اور مسائل سے ماخوذ ہے

پشت پناہی کرتی ہے لیکن مسلمانوں کو عرب اور اسلامی دنیا سے کوئی مدد نہیں ملتی بعض حکومتیں اور بعض عرب ممالک کے دولت مند اور اصحاب خیر حضرات کچھ اسلامی اور فلاحی اداروں کے ساتھ تعاون ضرور کرتے ہیں، مگر اس سے لبنانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی آئندہ نسلوں کے مستقبل پر جو اس ملک سے وابستہ ہے کوئی اثر نہیں پڑتا حالانکہ یہ ملک اپنے جغرافی اور سیاسی محل وقوع کی بنا پر بہت اہمیت رکھتا ہے اور عرب ملکوں کے حالات اور مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اوپر کے سطور میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ غیر مسلم طاقتوں نے لبنان میں مسلم عرب اکثریت کو بے اثر و بے دخل بنانے اور مسیحی فرقہ کو اس علاقہ میں دائمی اقتدار عطا کرنے کے لئے منصوبہ بند طریقہ پر کام کیا اور سب کچھ ایک مکمل و مرتب اسکیم کے ماتحت تھا، حسن اتفاق سے ابھی حال میں اس کا ایک دستاویزی ثبوت ملا ہے، ایک راز دارانہ تحریر ہے جو حکومت فرانس کی طرف سے عیسائی قائدین اور کارکنوں کی رہنمائی کے لئے مخفی طور پر تقسیم کی گئی تھی، یہاں اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

[یہ اس منشور کا عربی ترجمہ ہے، جو ۱۹۱۹ء میں اتفاق سے لبنان کے ایک کلیسا میں فرانسیسی زبان میں لکھا ہوا ملا تھا]

"مادر حکومت کی جانب سے اس کے مخلص فرزندوں کے نام۔

اے یسوع مسیح کے بیٹو!

اے وہ جنہوں نے اپنے عقائد کے تحفظ اور دفاع کے لیے صدیوں تک ذلت و رسوائی کو برداشت کیا، اے شرفاء اطہار! یہ وصیتیں ہمیشہ یاد رکھئے:

(۱) یہ وطن آپ ہی کے لیے وجود میں آیا ہے، تاکہ آپ اپنا شیرازہ اکٹھا کر سکیں

اور تاریخی جنگ کے بعد اپنی آزادی سے متمتع ہو سکیں۔ آپ کو یقین کرنا چاہیے۔ یہ مالک کے مسیحی لبنانی ہیں اور صحرا سے آنے والے عربوں کو صحرا واپس جانا چاہیے۔

(۲) ہم نے آپ کے لیے وہ تمام اہم انتظامات کر دیئے ہیں جو اس علاقے میں آپ کی خوشحال زندگی کے ضامن ہیں۔ مثلاً ملکیت اراضی، غیر ملکی ایجنسیاں، سیاسی صورتحال وغیرہ۔ اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان معاملات کا تحفظ کریں اور ان میں روز افزوں اضافہ کریں۔

(۳) تفریح گاہوں اور سیاحتی انتظامات پر قبضہ کرنے کی کوشش کیجیے اور جب آپ اکثریت میں ہو جائیں تو عربوں کو ان کی بستیوں سے نکال دیجیے، بیروت کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جہاں مسلمان نہ ہوں ایک بندرگاہ کی تعمیر ہرگز نہ بھولیے۔ جس وقت بھی موقع ملے اور حالات سازگار ہوں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کیجیے۔

(۴) دفاع کے تمام ذرائع تیار کیجیے مثلاً جسمانی ورزش، اسلحہ اور نوجوانوں کی تنظیمیں۔ ذوق سے دلچسپی لیجیے، اپنی بات پوشیدہ رکھیے، اپنے رفقاء پر اعتماد کیجیے اس لیے کہ دشمنوں کے ساتھ معرکہ بہت طویل اور مسلسل ہے۔

(۵) ادبی قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیجیے مثلاً کتابوں کی اشاعت اور تمام انجمنوں اور اکیڈمیوں پر آپ کا قبضہ ہو۔ ہرگز یہ تسلیم نہ کیجیے کہ آپ کی زبان کا سرمایہ تنہا مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ اور بغیر کسی رو رعایت کے ان تمام افکار و اشخاص سے جنگ کیجیے جو آپ کے رجحانات کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۶) اپنے باہمی اختلافات کو نظریاتی اور سطحی حد سے آگے نہ جانے دیجیے

کیونکہ آپ کی زندگی کا دارومدار کافر دشمن کے مقابلہ میں آپ کے اتحاد و یکجہتی پر ہے اور آپ تو اس بیسو سال کے قرن میں بھی جس نے ہم کو محبت کا درس دیا ہے۔

(۷) دوسروں کے منصوبوں کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیے، اور ان کے ساتھ مل کر کام کیجیے تاکہ اندرونی باتوں کا علم ہو سکے، اور ضرورت کے وقت ان کی ظاہری تائید میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن کلیسا اور سرداروں سے ہر شخص کا رابطہ استوار ہونا چاہیے اور اپنے مخلص پادریوں کے احکام کی نافرمانی نہ کرنی چاہیے۔

(۸) سربلند کیجیے اپنے سروں کو اور اپنے شعار کو بلند کیجیے اور یقین کیجیے کہ آزاد دنیا کی تمام عظیم طاقتیں بہت جلد آپ کے ساتھ ہوں گی لیکن اپنا کام اس طرح کیجیے کہ گویا آپ کو اس کا قطعاً علم نہیں ہے۔

(۹) طبی اور شخصی خدمات کے ذریعہ عرب بادشاہوں اور سربراہوں سے قریب ہونے کی کوشش کیجیے، یہ سہل ترین بات ہے۔ اس سے کام کا وسیع میدان ملے گا، بڑی دولت حاصل ہوگی اور ان ملکوں میں بھی گھسنے کا موقع ملے گا، جہاں آپ کا داخل ہونا دشوار ہے۔

(۱۰) لبنانی قومیت کا معرکہ بہت اہمیت رکھتا ہے، بڑی ہوشمندی اور باریک بینی سے کام لیجیے تاکہ اپنے اکثریتی حقوق کا تحفظ کر سکیں ورنہ تمام کوششیں رائگاں جائیں گی۔"

دارالافتاء میں ایک اعزازی تقریب

جمعرات کے روز ۳ رجب ۱۳۹۰ھ مطابق ۳ اگست ۱۹۷۰ء کو شیخ حسن خالد مفتی لبنان

نے وفد کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا جس میں لبنان کے موجودہ وزیر اعظم استاذ تقی الدین الصلح، سابق وزیر اعظم استاذ صائب سلام، متعدد وزراء مملکت، ممبران پارلیمنٹ، علمائے دین، مشہور علماء، قضاۃ، ادباء و مفکرین کی بڑی تعداد شریک تھی۔

لبنان یونیورسٹی اور بیروت کی عربی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر صبحی صالح نے تعارفی تقریر کی، راقم سطور کی تصنیفات خصوصاً العرب والاسلام اور تحریک ندوۃ العلماء کا تفصیلی جائزہ لیا، پھر راقم سطور نے تقریر کی جس میں ان حضرات اساتذہ و دوستوں کا شکریہ ادا کیا جن کی بدولت وفد کے قیام اور اس کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں سہولت ہوئی، اس کے بعد لبنانی مسلمانوں کے نازک موقف پر احتیاط سے روشنی ڈالی جس ملک میں وہ زندگی گزار رہے ہیں اور جو مسائل ان کو درپیش ہیں ان میں لبنانی مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں اور اس سلسلہ میں اسلام کا ان سے کیا مطالبہ ہے، ان سب باتوں کی وضاحت کی، ذیل میں تقریر کا خلاصہ درج ہے، جو مقرر نے اپنے حافظہ کی مدد سے املا کرایا ہے۔

تہذیبوں کے سنگم اور عالمی اسٹیج پر مسلم قوم کا کردار

میں اپنی جانب سے رابطہ عالم اسلامی کے وفد کے ارکان اور اپنے رفیق محترم، مشہور اسلامی مصنف سعودی حکومت کی مجلس شوریٰ کے رکن، جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ کے استاذ اور وفد کے ممبر استاذ احمد محمد جمال کی جانب سے حضرت مفتی اعظم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہم کو لبنان کے قیام کے دوران اس اعزاز و اکرام سے نوازا، اور میں خاص طور پر حضرت مفتی محترم کا اس لئے بھی مشکور ہوں کہ آپ نے ہمارے لئے اتنی بڑی منتخب جماعت سے ملاقات،

تعارف اور گفتگو کرنے کا مبارک موقع فراہم کیا، جو لبنان کے مختلف طبقوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے، اگر خود ہم ان تمام حضرات سے ملاقات کی کوشش کرتے تو کبھی کامیابی نہ ہوتی۔

محترم حضرات!

مجھے صورت حال کی نزاکت اور آپ کی عظیم ذمہ داری کا پورا احساس ہے، آپ ایک ایسے ملک میں زندگی گزار رہے ہیں جو مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور مختلف زبان وادب کا سنگم ہے، آپ کی ذمہ داری بہت عظیم اور آپ کا کام بہت نازک ہے، اور بڑی ذہانت، دور اندیشی، بیدار مغزی، گہری سوجھ بوجھ، پیش بینی اور معاملہ فہمی چاہتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ جس مذہب اور پیغام کے آپ نمائندہ ہیں، اس پر پختہ یقین واعتماد، اور جن غلط فکری دھاروں سے آپ کا سامنا ہے، ان کے مقابلہ میں پورے ثبات و استقلال کی ضرورت ہے، اس عالمی کشمکش میں جس کی طرف ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں آپ کو ایک تعلیم یافتہ مسلم اور حکیم و پختہ مومن کا کردار ادا کرنا ہے، آپ کا ہر عمل ہر قدم اور ہر رویہ ریکارڈ ہوتا ہے، اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی اصولوں کی نمائندگی سمجھا جاتا ہے۔

حضرات! آپ دنیا کے سامنے ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلام میں صلاحیت ہے، میں نہیں کہوں گا کہ باقی رہنے کی، میرے نزدیک زندہ رہنے کی صلاحیت اور بقاء کے حق کی بھیک مانگنا کمتر درجے کی چیز ہے، نہیں بلکہ اسلام میں صلاحیت ہے قیادت کی، انسانیت کی [illegible] کی، ان مسائل کو حل کرنے کی جن سے

دنیا کے سامنے مفکرین اور قانون داں پریشان اور عاجز ہیں، اسی طرح آپ اپنے دین کی ایسی خدمت انجام دیں گے جو کوئی قوم اور عرب بلکہ سارے عالم اسلام میں کوئی ملک بھی انجام نہیں دے سکتا، اور حیران و مضطرب عرب دنیا اور عالم اسلام کے سامنے ایک قیادت پیش کر سکیں گے۔

حاضرین کرام!

آپ کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ آپ کو مغربی تہذیب اور عصر حاضر کے چیلنج کا براہ راست مقابلہ ہے، جو بہت سی دوسری عرب اور مسلم اقوام کو نہیں ہے، آپ مغربی تہذیب کے محاذ پر ہیں، آپ ایک نازک آزمائش گاہ اور ایک عملیاتی تجربہ گاہ میں ہیں، اور سارا عالم اسلام اس تجربہ اور آزمائش میں آپ کی سربلندی اور کامرانی کے لئے چشم براہ ہے۔

اگر اس رزمگاہ میں آپ کامیاب ہوئے اور اپنا راستہ نکال لیا تو آپ کے دوسرے ہمسایہ عرب اور اسلامی ملکوں کے لئے بھی راہ کھل جائے گی، بلاشبہ یہ ذہانت و ذکاوت کی آزمائش ہے، ایمان و یقین کی آزمائش ہے، بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی آزمائش ہے، اور جن صلاحیتوں اور طاقتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے، اور جو مواقع آپ کے لئے فراہم کئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے مجھے پوری امید ہے کہ اس امتحان میں آپ سرفرازی اور سربلندی سے ہمکنار ہوں گے۔ بہرحال ان میں جو شب و روز ہم نے گزارے ہیں، ان سے ہمارے حوصلوں کو بلندی اور امیدوں کو تازگی اور تقویت ملی ہے، اور جیسا کہ میں نے ہر مجلس میں کہا تھا، اس ملک میں آپ کے وجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو اس سیلاب کے روکنے، اسلام دشمن عناصر سے نبرد آزما ہونے اور اسلامی تہذیب و تمدن بلکہ دین اسلام کا علم بلند کرنے کا اہل اور مستحق و سزاوار سمجھا ہے آپ کو اس اعتماد اور اعزاز پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت فرمائے، آپ کو ہر محاذ پر ثابت قدم رکھے اور آپ کے دلوں کو تقویٰ و اخوت اور یگانگت کے جذبات سے معمور فرمائے۔

حضرات! میں نے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور انسانی معاشروں کا جو عمیق و وسیع مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ زمان و مکان اور ماحول و متعلقات سے قطع نظر اسلامی تہذیب کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو مغربی تہذیب سے زیادہ طاقتور، زود اثر اور اس سے زیادہ نفوذ و وسعت رکھنے والی کوئی تہذیب آج تک نہیں پائی گئی، مغربی تہذیب انسانی معاشرے کے ہر گوشہ میں داخل ہو گئی، خیالات و جذبات پر غالب آ گئی، زندگی کی قدروں کو بدل ڈالا، سوچنے اور سمجھنے کے انداز پر اثر انداز ہوئی، غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس پر اس کا تسلط اور تصرف نہ ہو، وہ غریبوں کے جھونپڑوں میں بھی موجود ہے اور امیروں کے نگار خانوں میں بھی۔

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب دونوں چونکہ انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور انسان کے مسائل و ضروریات سے بحث کرتی ہیں اس لیے کچھ نقطوں پر ان کا اتصال ہوتا ہے، اور کچھ نقطوں پر ان کا افتراق، بعض مواقع پر دونوں کا راستہ ایک ہو جاتا ہے اور بعض مواقع پر دونوں کے راستے مختلف

ہو جاتے ہیں۔

بحیثیت مفکر اور اسلام کے محرم راز کے نیز چونکہ اس مسلم ملک میں آپ رہتے ہیں، آپ کا فرض ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک باریک اور واضح لائن کھینچ دیں جو فرق و امتیاز کا کام دے۔ ان چیزوں کے درمیان جن کا اخذ کرنا مغربی تہذیب سے صحیح ہو اور جن کا اخذ کرنا صحیح نہ ہو، بے حیائی، بے پردگی اور بے جا زیب و زینت کے درمیان اور اس پردہ اور احتیاط کے درمیان جس کا اسلام نے حکم دیا ہے، لطف اندوزی اور کھیل کود کی اس حد کے درمیان جسے اسلام نے جائز قرار دیا ہے اور حدود و قیود سے نا آشنا ہو کر اس نفس پرستی، شہوت رانی اور حیوانیت کے درمیان جو اسلام میں ممنوع قرار دی گئی ہے۔ ایسی لائن جو باریک بھی ہو اور واضح بھی، اتنی باریک بھی نہ ہو کہ ظاہر نہ ہو اور اس کو کوئی دیکھ نہ سکے، ایسے باریک خط سے کوئی فائدہ نہیں جو لوگوں کو دکھائی نہ دے، اور یہ لائن اتنی موٹی اور بھدی بھی نہ ہو کہ لوگوں کو گراں گزرے، زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں حائل ہو جائے اور دشواری پیدا کر دے۔ ایسی لائن جس پر ہر مسلمان جو اپنے دین پر ایمان رکھتا ہو اور دینی شریعت کا احترام کرتا ہو، آ کر رک جائے اور اس کو پار کرنے کی جرأت نہ کرے۔ ایسی لائن کسی کا بھی اسلامی ملک میں جس کا مغربی تہذیب اور جدید عصر کے فکری دھاروں سے مقابلہ درپیش ہے، موجود نہیں ہے، چنانچہ ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے، مسلمان اس تہذیب کے طور طریق اور علوم و افکار سے استفادہ کرنے میں تمام حدود کو پھلانگ گئے ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوان بلکہ ارباب علم و فکر کا

طبقہ بھی موجودہ صورت حال کے سامنے یکسر سپر انداز ہو گیا ہے آپ کے لئے یہ خطرہ کہیں نمایاں، آسان اور زیادہ ممکن ہے اس لئے کہ آپ ایسے ملک میں بستے ہیں، جہاں مغربی تہذیب کا دور دورہ ہے اور جو اس تہذیب کو اپنانے میں بہت آگے جا چکا ہے، اس کے ساتھ ساتھ آپ —— اس وقت میرا خطاب یہاں کی دار الافتاء سے ہے —— اسلامی روح اور اسلامی قانون کا وسیع اور عمیق علم رکھتے ہیں، میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور میری تمنا ہے کہ آپ اس کار عظیم کو بخوبی انجام دیں، اس لئے کہ اس کام کا ہماری زندگی اور مسلمانوں کے مستقبل پر بہت گہرا اور ہمہ گیر اثر ہوگا۔

حضرات علمائے کرام!

آپ کی تیسری ذمہ داری میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ جس معاشرہ میں زندگی گزار رہے ہیں، اس کے سامنے ایسی چیز پیش کیجئے جو اس کے پاس نہیں ہے، آپ اس خلا کو پر کیجئے، جو بہت دنوں سے پیدا ہو گیا ہے، علم و ثقافت، تہذیب و تمدن، اشکال و مظاہر اور عیش و طرب کی زیادتی نے اس معاشرہ کو مرض تخمہ میں مبتلا کر دیا ہے، اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ اس چیز کی قدر کرتا ہے، جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی اور اس شخص کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے پاس یہ چیز ہوتی ہے، تو یہ ترقی یافتہ معاشرہ جو علم و تہذیب کے نقطۂ عروج پر ہے، معلومات کی کثرت، علم کی زیادتی، طلاقت لسانی، زور خطابت اور آرائش و زیبائش سے زیر نہیں ہو سکتا، وہ زیر ہو سکتا ہے تو اسی چیز سے جو اس کے یہاں نایاب ہے۔

جس میں وہ مفلس اور قلاش ہے، وہ قناعت سادگی، زہد، ضبط نفس،
جاہ و منصب کے سحر و طلسم سے آزاد ہونے اور زندگی کے رنگین و خوشنما اور
کھوکھلے مظاہر سے بے اعتنائی ہی سے زیر ہوگا۔

یہ معاشرہ اس میدان میں بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے، وہ یہ ماننے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہے، جو اس لذت و راحت کو ٹھکراتا اور ان "بلند قدروں" کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو ہماری دنیا کا ایمان ہے، اور سارے لوگ جن کی پرستش کرتے ہیں۔

آج علم و عقل کا بحران نہیں ہے، مال و دولت کا بحران نہیں، تہذیب و تمدن کا بحران نہیں ہے، بحران اس زندہ ضمیر کا ہے، جو خریدا نہ جا سکے جو کہیں کھو نہ جائے، جو کسی سودے بازی کو قبول نہ کرے، اس دل کا بحران ہے، جو زندگی اور ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال ہو۔

آج دل و ضمیر کا یہ حال ہے کہ ــ میری مراد نہ کسی ایک ملک سے ہے نہ کسی ایک شخص سے ـــــ وہ سامان خرید و فروخت ہو گئے ہیں، جن کی بولی ہوتی ہے، جن کو خریدا اور بیچا جاتا ہے، مسئلہ سامان کا نہیں اس قیمت کا ہے جو ادا کی جاتی ہے، اور جس سے ضمیروں اور اصولوں کو خریدا جاتا ہے، آج سارے لیڈر اور قوم کے ناخدا حکومت کی کرسیوں اور پارٹی کی لیڈرشپ کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، خواہ اس کے حصول میں کوئی قیمت بھی ادا کرنی پڑے۔

بلاشبہ یہ دل و ضمیر اور شخصیت و اخلاق کا بحران ہے جس نے اسلامی ملکوں میں صحیح اور مستقیم قیادت کے بحران کو جنم دیا ہے، اور ایسے بے شمار

مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے، اور سارے لیڈروں اور قومی رہنماؤں کا اعتماد ختم ہو گیا۔

آپ جو اسلام کے علمبردار اور داعی الی اللہ کے عظیم منصب پر سرفراز ہیں، اس خلا کو پر اور اس شگاف کو بند کر سکتے ہیں، موجودہ معاشرہ اور موجودہ تہذیب کے سامنے زندگی، اخلاق اور شخصیت کا ایک نیا نمونہ پیش کر سکتے ہیں، اور اس طرح مذہب اپنا اعتماد اور علم اور ارباب علم اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک بار پھر میں جمہوریہ لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد اور ان کے شاگردوں اور دوستوں کا مشکور ہوں کہ انہوں نے ہماری عزت افزائی فرمائی اور لبنانی مسلمانوں سے ملنے، ان کی سرگرمیوں اور ان کے علمی و ثقافتی اداروں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔"

جن مقامات کو ہم نہیں دیکھ سکے

شیخ مفتی حسن خالد کا بہت اصرار تھا کہ ہم "بقاع" کا دورہ بھی کریں جو ایک بڑا اسلامی علاقہ ہے، اس علاقہ کا ایک وفد بھی ہماری ملاقات کے لئے آیا تھا، اور وہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی، اسی طرح جبیل دیکھنے کا موقع بھی تھا، جو مشہور تاریخی شہر ہے، جب ہم نحو کی پہلی کتاب پڑھ رہے تھے اسی وقت سے اس کا نام ہمارے کانوں میں گونجتا رہا ہے، مگر وقت کی تنگی کی بنا پر ہم کو معذرت کرنی پڑی، اور ۵ رجب ۱۳۹۳ھ (۴ اگست ۱۹۷۳ء) کو جمعہ کے روز دمشق جانے کے لئے چلے گئے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی چیز ہمیں دمشق جانے پر

مجبور کر رہی تھی، تاکہ وہاں ہم کو ایک نئے تجربہ سے دوچار ہونا پڑے اور ہم اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ملاقاتیں

اس دورہ کے اثنا میں جن قابل ذکر ملاقاتوں کا موقع ملا ان میں مجاہد عالم شیخ نزار خطیب سے ملاقات تھی، وہ ہمارے دیرینہ دوست ہیں، ۱۹۵۱ء سے تعارف ہے، میرے دمشق میں قیام کے دوران وہ بھی وہیں مقیم تھے، اس وقت وہ بیروت میں جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیہ کے صدر اور جمعیت کے تحت چلنے والے مدرسۃ الفتح الثانویہ کے ناظم بھی ہیں، یہ لڑکیوں کا مدرسہ ہے، ۱۹۶۶ء سے تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے، اس مدرسہ نے لبنان کے مسلم معاشرہ میں ایک بہت بڑے خلا کو پر کیا ہے، اور صالح تعلیم یافتہ اور باشعور خواتین کی ایک نسل تیار کی ہے، اسلامی آداب اور اسلامی شعائر کی پابندی کی اور تبلیغ میں اس مدرسہ نے لائق تحسین کردار ادا کیا ہے۔

استاذ محمد مبارک سے بھی ملاقات ہوئی، جو سوریا کے سابق وزیر، دمشق میں کلیۃ الشریعۃ کے سابق پرنسپل اور کلیۃ الشریعۃ مکہ کے موجودہ استاذ ہیں، اسلامی مفکرین اور مصلحین کی صف اول کے آدمی ہیں۔

استاذ عمر داعوق سے ملاقات ہوئی جو لبنان کی جماعت عباد الرحمٰن کے بانی ہیں اور دعوت و تبلیغ کے کاموں میں قائدانہ حصہ لیتے ہیں۔

مکتب اسلامی بیروت کے مالک استاذ زہیر شاویش سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے اسلامی مفکرین کی کثیر التعداد علمی اور فکری تصنیفات کو بڑی تحقیق اور اہتمام سے شائع کیا ہے، اسی طرح کعب محترم، استاذ علی حسن فدعق سے بھی ملاقات ہوئی، جو جدہ کے میئر رہ چکے ہیں، میری ملاقات

ان سے ۱۹۵۱ء سے ہے، جب وہ وزارت مالیہ میں ایک اچھے عہدہ پر فائز اور ریڈیو اور صحافت میں اول اول نمودار ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑی وضعداری اور شرافت کے ساتھ اس تعلق کو قائم رکھا ہے، اور وہ راقم سطور کے مخلص دوستوں میں ہیں۔

یہ لبنان کی تمام اسلامی تنظیموں اور انجمنوں کے تذکرہ[1] اور ان کی جرح و تعدیل کا موقع نہیں ہے، اس کے لئے طویل قیام اور بہت معلومات کی ضرورت ہے، لیکن بعض انجمنوں اور تنظیموں کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہوگا، جن کا وہاں کے مسلم معاشرہ پر اثر پڑا ہے، مثلاً جمعیۃ المقاصد الاسلامیۃ، جمعیۃ تعلیم بنات المسلمین فی القری، مؤسسۃ الخدمات الاجتماعیۃ، جمعیۃ المحافظۃ علی القرآن الکریم، جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیۃ فی بیروت، الجماعۃ الاسلامیۃ، ان اداروں اور انجمنوں کے علاوہ ہیں جن کا ذکر اس مختصر سرگزشت میں آیا ہے۔

سعودی سفارتخانہ کی جانب سے اعزازی تقریب

۴ رجب ۱۳۹۲ھ جمعرات کی شام کو سعودی سفارتخانہ نے وفد کو استقبالیہ دیا جس میں شہزادہ امیر مشعب بن عبدالعزیز (ملک فیصل کے بھائی) عرب اور مسلم حکومتوں کے سفراء، ڈپلومیٹ، معززین شہر اور صحافیوں کی بڑی تعداد شریک تھی، یہ وفد کے دورۂ لبنان کی آخری کڑی تھی، اور جمعہ کے روز ۵ رجب ۱۳۹۲ھ (۱۴ راگست ۱۹۷۲ء) کو دمشق کا سفر طے ہو چکا تھا۔

* * *

---

[1] معلوم ہوا کہ ان کی تعداد ڈیڑھ سو ہے، اور اکثر کا مستقر بیروت ہی میں ہے۔

دو دن

دمشق میں

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

بیروت سے دمشق

بیروت کے سعودی سفارت خانہ نے دمشق کے سعودی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیا اور اسے اطلاع دی کہ وفد کی بیروت سے دمشق روانگی کا پروگرام جمعہ کے روز ۱۷ ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۸۳ء کو ہے۔

ہم سویرے ہی سے سفر کے لئے تیار ہو گئے، ہماری خواہش تھی کہ روانگی صبح سویرے ہی ہو کیونکہ جمعہ کا روز تھا اور ہم کو لبنان اور شام کی سرحدوں سے گزرنا تھا۔ ان دنوں یہ سرحدیں بند تھیں، مگر ہمارا سفر رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی حیثیت سے ہو رہا تھا، رابطہ عالم اسلامی نے پہلے جدہ اور دمشق کے سرکاری حلقوں سے رابطہ قائم کیا تھا، شام کی حکومت نے وفد کے استقبال اور اس کی میزبانی کے لئے آمادگی بھی ظاہر کی تھی۔

دمشق سے سعودی سفارت خانہ کا ایک نمائندہ بیروت آیا اور وفد کو اس نے اطمینان دلایا کہ حالات معمول کے مطابق ہیں، اور وہ خود سرکاری کارروائیوں کو مکمل کرنے کے لئے ہم سے پہلے ہی شتورہ پہنچ گیا، اس کے بعد ہم بھی پہنچے اور ضروری کاموں سے فرصت حاصل کی۔

دمشق سے میرا دیرینہ تعلق

ہم دمشق روانہ ہو گئے، دمشق جہاں میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی زندگی کے خوشگوار ترین لمحات گزارے ہیں، حرمین شریفین کے بعد اگر کسی شہر کو میں اپنا محبوب ترین شہر کہہ سکتا ہوں تو وہ دمشق ہی ہے، میں اس کے بہت سے محلوں، سڑکوں اور باغات و مناظر سے واقف ہوں، دمشق میں میرے عزیز ترین احباب اور دوست تھے جن سے خاص فکری اتحاد اور مناسبت تھی، اور دمشق کا قیام ہمیشہ میرے لئے خوشگوار اور مسرت بخش ثابت ہوا، دل کو سکون اور روح کو راحت نصیب ہوئی، آب وہوا راس آئی، میں جب شوقی کا یہ شعر پڑھتا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا تھا۔

آمنت بالله واستثنيت جنته
دمشق روح وجنات وريحان

ترجمہ: اللہ تعالیٰ پر میرا ایمان ہے، میں اس کی جنت کو مستثنیٰ قرار دے کر کہتا ہوں کہ دمشق سراپا باغ وبہار اور "روح وریحان" ہے۔

ہم دمشق کی طرف بڑھ رہے تھے، باہر سے آنے والے کے لئے دمشق کا راستہ دنیا کے حسین ترین راستوں میں سے ہے، معروف اور مانوس مقامات سے ہمارا گزر ہو رہا تھا، حماسی شاعر صمۃ بن عبد اللہ کے یہ اشعار میری زبان پر تھے۔

بنفسي تلك الأرض ما أطيب الربى　　وما أحسن المصطاف والمتربعا
وليست عشيات الحمى برواجع　　إليك ولكن خل عينيك تدمعا

ترجمہ: اس سرزمین پر قربان جاؤں، اس کے ٹیلے کتنے خوشگوار و نغز اور

موسم بہار اور گرمی گزارنے کے مقامات کتنے خوبصورت ہیں۔

حمص کی شامیں اب واپس آنے والی نہیں ہیں۔ اس لئے آنکھوں کو جی بھر کر دیکھ لینے دو۔

میرا دمشق کا پہلا سفر رمضان، ذی القعدہ ۱۳۷۴ھ مطابق جون اگست ۱۹۵۵ء میں ہوا تھا، یہ کرنل ادیب الشیشکلی کا زمانہ تھا، ڈیڑھ مہینہ تک میرا قیام رہا، میں نے اپنے تاثرات اپنی ڈائری میں قلمبند کئے تھے۔[1]

دوسرا سفر ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں ہوا، اور تین مہینے تک قیام رہا، یہ سفر دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ کی دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے پیش آیا تھا، اس وقت شکری القوتلی صدر جمہوریہ تھے۔

گزشتہ شام کے معاشرہ کی چند جھلکیاں

شام کے معاشرہ اور اس کی عام زندگی کی ان خصوصیات میں جن میں وہ اپنے دوسرے عرب اور پڑوسی ملکوں سے ممتاز تھا، ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ فرق و اختلافات سے قطع نظر مذہب کو عوام کے دلوں میں اثر و رسوخ اور ایک خاص مقام حاصل تھا، معاشرہ علماء کا احترام کرتا تھا، ملک میں بہت سے اسلامی اخلاق و آداب اور مشرقی روایات رائج اور باقی تھیں، پورے ملک پر ایک عربی اور اسلامی چھاپ تھی، بے پردگی پہلے دور میں شاذ و نادر اور دوسرے میں کم تھی، اگرچہ وقت اور رجحانات کی تبدیلیوں کے آثار صاف نمایاں تھے جن کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے بصارت اور معمولی سوجھ بوجھ کافی تھی، اس کے لئے بصیرت اور غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔

---

[1] اس سفر کی تفصیلات کے لئے دیکھئے مصنف کی کتاب "مذکرات سائح فی الشرق العربی" ص ۲۰۸ - ۲۱۳

خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی، ان حالات کا تقاضا تھا کہ اسلام اور اس ملک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین اور قائدین اس خطرے کی جانب فوراً اپنی توجہ مبذول کریں، مختلف سیاسی نظریات اور مختلف سیاسی پارٹیاں موجود تھیں، وزارتیں تیزی سے ٹوٹ رہی تھیں، حالات میں عدم استقرار اور بے یقینی کی کیفیت رہتی تھی، علماء کے اندر اختلافات تھے، اور ایک کو دوسرے سے مختلف قسم کی شکایتیں تھیں، دینی جماعتوں اور تنظیموں میں اتحاد اور ہم آہنگی مفقود تھی۔

دوسری خصوصیت جس میں شام اپنے عرب پڑوسیوں سے ممتاز تھا اور جسے باہر سے آنے والا ہر شخص محسوس کرتا تھا، وہ تھی وہاں کی خوشحالی، سکون اور دولت کی فراوانی، زمانۂ قدیم ہی سے اللہ تعالیٰ نے اس ملک کی سرزمین کو زرخیز اور میوہ جات اور سبزیوں سے مالا مال کیا تھا، ہر طرف نہریں رواں اور شفاف و شیریں چشمے جاری تھے، باغات اور مرغزاروں کی کثرت تھی، تجارت کو فروغ حاصل تھا، کسب حلال کے دروازے کھلے ہوئے تھے، نہ گرانی تھی نہ اشیاء کی نایابی، نہ بے روزگاری تھی نہ کساد بازاری، بارشیں اپنے وقت پر ہوتی تھیں، پیداوار میں کوئی کمی نہیں تھی، ملک میں مشکل سے کوئی شخص بیکار، حالات سے بددل اور بے زار اور ناشاکی نظر آتا تھا، سوائے اس کے کہ کسی شخص کی فطرت ہی شکایت اور ناشکری کی ہو، عوام زندگی کی آسائشوں اور راحتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، شب و روز بہت سکون اور آرام سے گزرتے تھے، داد و دہش اور خورد و نوش میں بڑی فراخدلی اور وسعت نظر آتی تھی، گرمیاں گزارنے لوگ پہاڑوں پر (جو دمشق سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہیں) خصوصاً دمشق اور دوسری تفریح گاہوں پر جاتے تھے اور وہاں دعوتوں اور تفریح طبع کی صحبتیں گرم ہوتی تھیں۔

له ایسی تفریح گاہوں [illegible] بلودان، زبدانی [illegible] بحمدون [illegible] ہیں۔

میں جب شام کے باشندوں کو ان نعمتوں سے بہرہ مند، وہاں راحتوں اور آسائشوں سے متمتع ہوتے دیکھتا تھا تو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں شام کے باشندے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ان راحتوں اور آسائشوں کی قدر شناسی میں کوتاہی نہ کریں اور ان نعمتوں کا بھرپور حق اور شکر نہ ادا ہو پائے۔

اس خوشحال زندگی اور اس پرسکون اور نعمتوں سے بھرپور معاشرہ کی — جو کسی نہ کسی حد تک اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر ایمان رکھتا تھا اور مشرقی روایات کا پابند اور قدردان تھا — ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ افراد کے اندر باہمی احترام و خیر خواہی اور پیار و اخوت کے نیک جذبات موجود تھے۔ اور اسی وجہ سے اس معاشرہ میں ایک روحانی سکون پایا جاتا تھا۔

ایک یورپین فاضل جو دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی وقفہ میں شام گئے تھے اور عرصہ تک مقیم رہے تھے اس سے خاصے متاثر اور کسی قدر متعجب ہوئے تھے۔

محمد اسد سابق (LEO, POLD VEISS اپنی مشہور کتاب (ROAD TO MECCA) میں دمشق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اہلِ دمشق کی زندگی میں مجھے ایک روحانی سکون نظر آیا، باہم ایک دوسرے کے ساتھ ان کا جو رویہ اور معاملہ کرنے کا طریقہ تھا اس میں یہ روحانی سکون اور باطنی طمانیت نمایاں دیکھی جا سکتی تھی۔"

آگے مختلف طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"دکان والوں کے باہمی معاملات کے طور طریق میں بھی یہ چیز نمایاں تھی چنانچہ چھوٹے بساطیوں میں بھی جو فٹ پاتھ پر آواز لگاتے ہیں کسی طرح کے خوف و ہراس یا حسد و رقابت کے جذبات نہیں پائے جاتے تھے اگر کسی دوکاندار کو کچھ دیر

کے لیے کہیں باہر جاتا ہوتا تو اپنی دکان اپنے پڑوسی اور ہم پیشہ حریف کی ذمہ داری پر چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ بارہا میں نے دیکھا کہ خریدار ایک دوکان کے سامنے کھڑا ہے، دوکان کا مالک موجود نہیں ہے، خریدار شش و پنج میں ہے کہ دوکاندار کی واپسی کا انتظار کرے یا پڑوسی کی دوکان پر جائے، اتنے میں پڑوسی کا دوکاندار جو غیر حاضر دوکاندار کا ہم پیشہ حریف ہے آتا ہے، خریدار کی ضرورت دریافت کرتا ہے، اور اس کا مطلوبہ سامان اپنی دوکان سے نہیں بلکہ اپنے غیر حاضر پڑوسی کی دوکان سے دیتا ہے اور قیمت اس کی نشست گاہ پر چھوڑ دیتا ہے، یورپ میں اس طرح کے نمونے کہاں نظر آتے ہیں؟![1]

بلاشبہ مشرقی ممالک میں بشمول مرکز اسلام زمانہ کی تبدیلیوں اور مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں کے مسموم اثرات کے نتیجہ میں یہ باہمی اعتماد، بھائی چارہ، خیر سگالی اور اجتماعی خیر خواہی کی فضا بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے، جس کی بنا پر یہ باطنی سکون اور روحانی اطمینان بھی مفقود ہو گیا ہے۔

لیکن دونوں مرتبہ جب میں شام گیا تھا تو وہاں کے معاشرہ میں یہ چیز کسی نہ کسی حد تک موجود تھی۔

اخیر دور میں شام کی زندگی اور حالات میں انقلاب

تیسری بار ۱۹۶۲ء کے موسم سرما کے آغاز میں شام جانا ہوا، جب میں یورپ سے ہندوستان واپس آ رہا تھا، دمشق میں میرا قیام تین روز رہا، شام متعدد فوجی انقلابات

---

[1] الطریق إلی مکہ ص ۱۹۷ ترجمہ "ROAD TO MECCA"

گزر چکا تھا جنھوں نے زندگی کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا اور پورے معاشرہ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، میں نے دیکھا کہ ان دلکش، جانفزا اور روح پرور مناظر میں سے اکثر ختم ہو چکے تھے، شام گزشتہ خوشحالی اور فراوانی سے محروم ہو چکا تھا، باغات جو وہاں کی اہم ترین صنعت کی بنیاد تھے، پیداوار کی کمی کا شکار تھے، بارش کا سلسلہ اکثر منقطع رہتا تھا، ابلتے ہوئے چشمے خشک ہو چکے تھے، اور پانی کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسے حالات و حوادث ہیں جن کا سیاست اور خصوصاً تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہم اس سلسلے میں کوئی بحث بھی نہیں کرنا چاہتے لیکن افسوسناک بات یہ تھی کہ حکومتوں کی بے ثباتی، حکمرانوں کی تبدیلی اور بار بار ملک کی سیاست اور انتظام میں فوج کی دخل اندازی کی بنا پر عوام میں مستقبل سے بے اطمینانی، مایوسی اور بے یقینی پیدا ہو گئی تھی، اور یہ بے اطمینانی اور بے چینی زندگی کے ہر میدان میں نظر آتی تھی خواہ وہ علمی اور تعلیمی میدان ہو یا فکری اور ادبی، سرکاری حلقے، خانگی زندگی، اجتماعی مواقع ہر جگہ یہ چیز نمایاں تھی، دوستوں کی گفتگو میں بھی ظاہر ہوتی تھی، اور ان کے چہروں پر بھی پڑھی جا سکتی تھی، تب مجھے ان انقلابات اور فوجی حکومتوں کے ہولناک نتائج کا اندازہ ہوا، اور معلوم ہوا کہ اشتراکی قائدین ملک کو ترقی دینے، خوشحال بنانے، عزت نفس اور شرافت انسانی کے شعور کو فروغ دینے، امن و سکون پھیلانے اور آزادی خیال عطا کرنے کے جو بے شمار "سرخ" خواب دکھلاتے تھے، وہ کس حد تک شرمندۂ تعبیر ہوئے، ان مقاصد کو پورا کرنے کا ذکر ہی کیا جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور جن سے انھیں دلچسپی ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ ان مقاصد و اقدار کی نفی کرتے ہیں، اور اس کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں، مثلاً مذہب، اخلاق اور روح وغیرہ۔

ان لیڈروں کا نعرہ تھا۔ روٹی، بھوکے لئے ایک لقمہ، قوم کی بنیادی ضروریات کی فراہمی، فٹ پاتھ کے آدمی کی کفالت، اور ان کی تگ و دو بھی انھیں مقاصد کے حصول کے لئے تھی، جب یہ مقاصد ہی حاصل نہ ہوئے تو اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ یہ فلسفے کوہ کندن کاہ برآوردن کے مصداق ہیں، اور اشتراکیت، قومیت، اور کمیونزم سب کے سب غیر عقلی اور غیر انسانی فلسفے اور نظامہائے حیات ہیں، جو محض خوش عقیدگی، خوش فہمی اور جذبات پر مبنی ہیں، جن کو عقل، عمل، تجربہ اور نتائج کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا، یا سلبی اصول و مبادی ہیں، جن کا مقصد تخریب یا نظام سے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

اور اب یہ چوتھا سفر دس برسوں کے وقفے کے بعد پیش آیا، یہ وقفہ ماہ و سال کے حساب سے طویل نہیں تھا لیکن حوادث سے پُر اور بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس وقفہ میں ملک متعدد انقلابات سے دوچار رہا، بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، کتنی حکومتیں آئیں اور گئیں، اسی وقفہ میں ۵ جون ۱۹۶۷ء کا روح فرسا حادثہ پیش آیا، اور ان عرب ملکوں کے نقشے میں جن کی سرحد اسرائیل سے ملتی ہے، اور جو عرب اسرائیل جنگ سے براہ راست دوچار ہیں بڑی اہم اور عظیم تبدیلیاں وجود میں آئیں، گویا یہ وقفہ مسلم عرب قوم کی تاریخ میں فیصلہ کن وقفہ تھا، جس کی جڑیں بہت گہری اور جس کے نتائج و اثرات بڑے دوررس تھے۔

ان قوموں کی زندگی اور حالات میں جن کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہے، اور جن کو خطرے کا براہ راست سامنا ہے، میں ان تغیرات اور حادثات کے آثار تلاش کر رہا تھا، کہ میری نظر شامی سرحدوں پر ایک بورڈ پر پڑی جس پر جلی خط سے لکھا ہوا تھا۔

"بعث[1] پارٹی مصنوعی سرحدوں سے باغی اور علاقائیت کی دشمن"۔

میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا: کیا صورت حال ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء میں بلکہ سامراجی دور میں بہتر تھی ـــــ خصوصاً سرحدوں کے سلسلہ میں ـــ یا اس وقت جب میں شام جا رہا ہوں۔

دمشق میں

خدا کا نام لے کر دمشق میں داخل ہوئے، سعودی سفارت خانہ گئے، سعودی سفیر شیخ محمد مطلق نے ہمارا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ ہمارا قیام فندق امیۃ الجدید[2] میں رہے گا۔ ہوٹل پہنچنے پر معلوم ہوا کہ جمہوریہ شام کے مفتی شیخ احمد کفتارو ہمارے خیر مقدم کے لئے تشریف لائے اور دیر تک بیٹھے رہے، جامع ابنا میں ان کی تقریر کا پروگرام تھا اس لئے چلے گئے، وہاں سے فارغ ہو کر ہم سے ملاقات کے لئے تشریف لائیں گے، ان کی جگہ پر شیخ بشیر البانی قاضی دمشق اور مفتی صاحب کے فرزند سید زاہر کفتارو موجود تھے۔ دونوں نے ہم کو خوش آمدید کہا اور شیخ کا سلام پہنچایا، کچھ دیر بعد شیخ احمد کفتارو بھی تشریف لائے، مدت کے بعد ملاقات ہوئی، ان ایام کی یاد تازہ ہوگئی جب ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی اور حی اکراد میں ان کے گھر پر، شیخ محی الدین[3] میں اور غوطہ میں دیر تک ساتھ بیٹھتے تھے اور تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔

---

[1] شام کی حکمران پارٹی۔

[2] دمشق کا سب سے بڑا ہوٹل جس میں حکومت کے مہمان اور دوسرے ملکوں کے معزز حضرات قیام کرتے ہیں۔

[3] دمشق کا ایک محلہ ہے، شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب ہے، شیخ اسی محلہ میں مدفون ہیں۔

جامع اموی میں

نماز جمعہ ادا کرنے جامع اموی گئے جس کا شدید اشتیاق تھا، اور اسی لئے ہم نے دمشق کے سفر کے لئے جمعہ کا روز طے کیا تھا۔ جامع اموی میں نماز جمعہ ادا کرنا ایک سعادت بھی ہے، اور اس سے ایک روحانی لذت بھی حاصل ہوتی ہے۔ میں جب مسجد میں داخل ہوا اور جمعہ کا خطبہ سنا تو شوقی کا دمشقی قصیدہ یاد آیا، اور پھر میری آنکھوں میں آنسو آگئے، جذبات کا ایک طوفان امڈ آیا، اور ذہن کے پردے پر یادماضی کے نقوش ابھر آئے۔ شوقی اپنے قصیدہ میں کہتا ہے۔

وقفت بالمسجد المحزون أسأله   هل في المصلى أو المحراب مروان
تغير المسجد المحزون واختلفت   على المنابر أحرار وعبدان
فلا الأذان أذان في منارته   إذا تعالى، ولا الآذان آذان

ترجمہ:- میں اس غمزدہ مسجد میں کچھ دیر کھڑا رہا، اور دریافت کرنے لگا کہ کیا
مصلی یا محراب میں مروان جیسا فاتح عالم موجود ہے؟
اس حزین و غمگین مسجد نے زمانہ کی نیرنگی کا تماشا دیکھا، اس کے منبر پر کبھی
آزاد انسانوں نے قدم رکھا، کبھی غلاموں نے۔
اب نہ اذان کا وہ نغمہ ہے جو کبھی اس کے میناروں سے بلند ہوتا تھا، اور
نہ وہ سننے والے ہیں جو اس کو سن کر تڑپ جاتے تھے۔

ملاقات

ہمارے دوستوں کو ایک طویل عرصہ کے بعد ہمارے دمشق آنے کی خبر ہوگئی تھی

بیشتر تو دمشق چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اب وہی حضرات رہ گئے ہیں جو یا تو اپنی پیرانہ سالی سے مجبور ہیں یا انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس ملک میں اسلام کی امانت کی حفاظت کریں گے اور اس کو سینے سے لگائے رہیں گے یوں بھی ملک شام کو ہمیشہ قیادت و رہنمائی کا مقام حاصل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ملک شام کی فضیلت میں جتنی صحیح اور کثیر احادیث وارد ہوئی ہیں، کسی ملک اور کسی شہر کے بارے میں وارد نہیں ہوئیں بعض احباب ہماری ملاقات کے لئے خود تشریف لائے اور ہمارا ارادہ تھا کہ بقیہ احباب سے بھی شام یا دوسرے دن حاضر ہوں گے۔

شام کی زندگی میں کچھ نئی تبدیلیاں

عصر کے بعد ہوٹل سے نکل کر جب ہم دمشق کی سڑکوں پر جا رہے تھے تو ہم کو دو نئی تبدیلیوں کا احساس ہوا، ایک تو یہ کہ لوگوں کی گفتگو میں رازداری اور بڑھی ہوئی احتیاط محسوس ہوتی جیسے ہر آدمی کو یقین ہو کہ اس پر پہرہ ہے، اور اس کی ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہے، ہر شخص قرآن کریم کے اس قول کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق۔ ۱۸)

وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔

بعض قابل اعتماد حضرات نے ہم سے کہا کہ آپ یقین رکھئے، ہر جگہ جاسوس پھیلے ہوئے ہیں، جہاں بھی آپ کا قیام ہوگا کچھ آنکھیں آپ کی نگرانی میں اور کچھ کان آپ کی گفتگو سننے میں مصروف ہوں گے، کوئی ہوٹل، کوئی بس، کوئی تفریح گاہ اور پارک اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ٹیکسی ڈرائیور کو کسی سے بھی اپنے آپ کو مامون نہ سمجھنا

چاہیے۔

دوسری تبدیلی یہ تھی کہ بے حجابا بے پردگی، وسیع پیمانے پر اور عجیب و غریب قسم کا جنسی اختلاط، راستوں اور سڑکوں پر ہر طرف فحش تصویریں اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اشتہارات چسپاں اور آویزاں تھے، بہت نوجوان بڑی تعداد میں موجود تھے، اور ہم کو اندازہ ہوا کہ یہ شہر اپنی قدامت پسندی اور وضعداری کے لئے مشہور تھا، آزادی، بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط میں بہت آگے جا چکا ہے، یہ بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط اکثر حالات سے بددلی کا نتیجہ اور ناکامیوں اور شکستوں کا ردعمل ہوتا ہے جس میں قوم کے افراد جن کے دل زخمی اور احساس کمتری میں گرفتار ہوتے ہیں ایک طرح کی تسکین پاتے ہیں، دوسری طرف خود حکومت کے ذمہ داروں اور قائدین کی طرف سے ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے کہ لوگوں کو ان سے محاسبہ، صحیح اسباب کی تلاش اور تنقید کی فرصت ہی باقی نہ رہے اور ساری قوم خود فراموش اور مست ہو کر رہے، پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ میں یہی پیش آیا تھا، اور مصر میں ۵ جون کے حادثہ کے بعد یہی ہوا۔

ان دونوں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جن کا تعلق زندگی کی اخلاقی اور معنوی قدروں سے ہے ایک تیسری تبدیلی بھی نظر آئی، ملک اقتصادی پسماندگی اور کسی قدر بدحالی کا شکار ہے آمدنی کے ذرائع تقریباً مفقود ہیں، شام اس خوشحالی سے محروم ہو چکا ہے جس میں گذشتہ عہد میں اسے امتیاز اور شہرت کا درجہ حاصل تھا، میں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ شام اور لبنان کے درمیان سرحدیں بند تھیں اس لئے ممکن ہے یہ ایک ہنگامی صورت حال ہو، مگر پھر معلوم ہوا کہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کیونکہ میں نے دیکھا کہ لوگ اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں، ایک شخص مصری کہہ رہے ہیں اور ان کو گذشتہ خوشحالی کی خوشگوار یادیں ستاتی ہیں،

جب دولت کی فراوانی تھی، لوگ امن وسکون کی زندگی گزار رہے تھے، اور شام اس آیت کریمہ کی تصویر نظر آتا تھا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ (النحل — ۱۱۲)

اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیب بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بستی) امن و اطمینان میں (رہتے) تھے (اور) ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہونچا کرتی تھیں۔

ماضی اور حال میں یہ نمایاں فرق مجھے ہر جگہ محسوس ہوا اور یہ عام فضا اور عام احساس بھی تھا، مگر میں نے اس کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی، میں نے کہا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے قوموں کی زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، اگر ملک باعزت، مستحکم اور طاقتور ہو، اس کی سرحدیں محفوظ ہوں، اس کی طرف دشمن نگاہ اٹھانے اور اس پر دست درازی کرنے کی جرأت نہ کر سکتا ہو، اور اس کی زمین کا ایک ایک انچ اس کے باشندوں کے قبضہ میں ہو تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، بسا اوقات ملکوں اور قوموں کو اس طرح کے تنگی کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ایک طویل عرصہ تک کفایت شعاری اور تنگی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے، لوگ صرف سد رمق کے لئے کھاتے اور تن ڈھانکنے کے لئے پہنتے ہیں، تفریح و تعیش کے سامان (luxury) سے محروم رہتے ہیں، مشرق اور مغرب کی بعض قوموں نے برسوں تک یہ زندگی گزاری ہے اور کسی طرح کی پریشانی اور اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا، آخر کار مشکلات و مصائب کے بادل چھٹ گئے، بحران ختم ہوگیا، اور کشادگی و خوشحالی کے ایام واپس آگئے، عرب اور مسلم اقوام کو تو بدرجۂ اولیٰ اس صبر و استحکام اور استقلال کا ثبوت دینا چاہئے کہ ان کا دین اسی کی تعلیم دیتا ہے

ان کے سامنے اسوۂ رسول اور صحابۂ کرام کی زندگی کا نمونہ ہے، اور اس پر ثواب کے بڑے بڑے وعدے ہیں۔

لیکن توجیہ اور تاویل کی ساری عمارت زمین پر آ رہی جب میری نظر جولان (گولان) کی بلندیوں پر پڑی جن پر اسرائیل کا تسلط ہے جس کی وجہ سے شام اور خود دمشق ایک دائمی خطرہ سے دوچار ہے، اور اسی سے ملک کا مستقبل وابستہ ہے۔ جب تک گولان پر یہودیوں کا قبضہ ہے، شام کا وجود اسرائیل کے رحم و کرم پر موقوف ہے، معلوم ہوا کہ گولان پر اسرائیل کا استیلاء بغیر کسی جنگ یا کشمکش کے ہوا تھا، شام کے باشندوں اور خود محاذ جنگ پر سرپیکار فوج کے لئے بھی یہ ایک خلاف توقع بات تھی جو بالکل ڈرامائی انداز میں پیش آئی۔

ملاقاتیں

شیخ احمد کفتارو کے ساتھ شارع مطار پر ان کے خوبصورت اور وسیع فارم میں ایک دلچسپ مجلس رہی۔ تصوف اور تزکیۂ نفس کی ضرورت، گھریلو دینی تربیت اور موجودہ زمانہ میں دعوت و تبلیغ کے اصول اور صحیح طریقۂ کار کے موضوع پر تبادلۂ خیال رہا۔ غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت اس کی نشاۃ ثانیہ اور مستقبل کے بارے میں شیخ بہت پر امید نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر مخلص و صاحب حکمت مبلغین اور داعی الی اللہ تیار ہو جائیں جو صحیح و واقعی اسلام کے اوصاف سے متصف ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ دین کی طرف راغب نہ ہو۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے اپنے دعوتی اور تبلیغی تجربات کا تذکرہ کیا، ان کو امریکہ اور روس کے دوروں میں جو انہوں نے ابھی حال میں کئے تھے، جو خوش آئند تجربے ہوئے اور وہاں کے ذمہ داروں اور نوجوانوں نے جس توجہ سے ان کی بات سنی اس کا وہ دیر تک

تذکرہ کرتے رہے۔

صبح ہی شیخ کی دعوت پر ہم لوگ ان کے فارم میں گئے اور دیر تک نشست ہوئی۔ طے ہوا کہ اتوار کے دن وزیر اوقاف جناب عبدالستار السید سے ملاقات کریں گے، وہیں جانے اور دورہ کا پروگرام مرتب کریں گے۔ پھر بعض تاریخی مقامات دیکھنے گئے اور بعض مسلم گھروں میں جانا ہوا۔ ہوٹل میں ہمارے پہنچنے کے دن ہی شام کو شام کے جلیل القدر عالم اور دینی پیشوا اور مربی شیخ حسن حبنکہ[1] تشریف لائے اور انھوں نے اگلے دن ہم کو کھانے پر مدعو کیا جس کو ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ اور ہفتہ کے روز ان کی قیام گاہ پر دوپہر کا کھانا کھایا، اس موقع پر ان کے خاندان کے چند افراد اور شہر کے وہ علماء تھے جن کا ان سے شاگردانہ و نیازمندانہ تعلق ہے دوستانہ اور برادرانہ مجلس رہی، گفتگو کا موضوع تھا: اسلامی شریعت اور اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام اور وہ طبعی کمزوریاں اور خوبیاں جو عورت کی خصوصیت ہیں۔

دمشق کے سعودی سفارت خانہ نے طے کیا کہ اتوار کو وفد کے اعزاز میں سفارت خانہ میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے گا جس میں وزراء، سفراء، علماء اور عمائدین شہر کو دعوت دی جائے گی۔ ہم نے طے کیا کہ دو شنبہ کی صبح کو حلب جائیں گے، اور راستہ میں ایک دو گھنٹہ کے لئے حمص اور حماۃ میں بھی ٹھہریں گے، اور پھر چہار شنبہ کو دمشق واپس آجائیں گے۔ دمشق میں دو دن قیام رہیگا

---

[1] شیخ حسن حبنکہ اس وقت شام کے سب سے مقبول عام واعظ اور مربی عالم ہیں۔ وہ اپنی اصول پسندی، حکومت سے بے نیازی کے باوجود اپنی پاکیزہ زندگی کی وجہ سے عوام و خواص میں یکساں طریقہ سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، دمشق کے مشہور محلہ میدان میں ان کا بیت ہے جو ہمیشہ سے علماء کا مرکز رہا ہے، اور جس کی حیثیت دمشق میں تقریباً وہی تھی جو لکھنؤ میں فرنگی محل کی تھی۔ ان کا ایک مکان اور آزاد دینی مدرسہ تھا، حکومت شام نے اس کو سرکاری انتظام میں لے لیا اور ان کو بے دخل کر دیا، اب بھی وہ درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں مشغول رہتے ہیں۔

اور اس اثنا میں مختلف جلسوں اور تقریبات میں شرکت کی جائے گی، ملاقاتوں وغیرہ کا پروگرام رہے گا، جسے مفتی صاحب اور وزیر اوقاف مشورہ سے مرتب کریں گے، پھر انشاء اللہ عمان روانگی ہوگی۔

عصر کے بعد شیخ سید مکی الکتانی[1] سے ملاقات کے لئے دمشق کی گرمی گزارنے کی مشہور جگہ زبدانی گئے، شیخ عرصہ سے خانہ نشین اور صاحب فراش ہیں، چلنے پھرنے سے معذور ہیں، دو سال سے رابطہ کے اجتماعات میں بھی شرکت نہیں کر سکے ہیں، کچھ دیر تک بڑے پرسکون اور خوشگوار ماحول میں ملاقات رہی، ان کا خاندان قدیم زمانہ سے مذہبی اور علمی خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، علم و دین کی خدمت اور علماء کی تنظیم میں شیخ نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

خواب جو حقیقت تھا

۱۰ بجے رات تک ہم ہوٹل واپس آگئے، دمشق کے بعض دوستوں اور اپنے بعض شاگردوں کو جنھوں نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی ہے وقت دے چکے تھے، لبنان کی بعض تقریریں جو قلمبند نہیں ہو سکی تھیں، ان کو بھی ان دوستوں کی مدد سے قلمبند کرنے کا خیال تھا، بعض عزیزوں کی معیت میں قدیم دوستوں اور دمشق کے بزرگوں کی ملاقات کے لئے جانا تھا

---

[1] سید مکی کتانی شام کے مشہور عالم، شیخ طریقت اور رابطۃ العلماء شام کی جمعیۃ العلماء کے صدر اور رابطہ عالم اسلامی مکہ کے ممتاز رکن تھے، ان کا خاندان مغرب اقصیٰ کا مشہور سادات کا خاندان ہے، کتانی کے نام سے مغرب اور مشرق عربی ممالک میں مشہور ہے، اس خاندان میں بڑے بڑے محدث اور صوفی گزرے ہیں، سید مکی کتانی کے والد سید جعفر کتانی جلیل القدر محدث اور شیخ طریقت تھے، انھوں نے ہجرت کر کے دمشق میں بود و باش اختیار کی، افسوس ہے کہ ۱۳۹۳ھ میں سید مکی کتانی صاحب نے اس دار فانی سے رحلت کی، رحمہ اللہ تعالیٰ و غفر لہ۔

جن سے شام کے گزشتہ سفروں میں ایسے روابط قائم ہوگئے تھے جن میں مرورِ ایام سے کوئی کمزوری نہیں آئی، جیسے علامۃ الشام شیخ محمد بہجۃ البیطار، سابق مفتی شام ڈاکٹر ابوالیسر عابدین[1]، شیخ احمد الدقر صدر الجمعیۃ الغراء[2] اور شیخ زین العابدین[3]۔ ان حضرات میں بعض مریض رہتے ہیں اور بعض ضعیف ہو چکے ہیں۔ مجمع اللغۃ العربیۃ بھی جانے کا خیال تھا جس کا ۱۹۵۶ء سے میں رکن ہوں، اسی طرح شیخ اکبر اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزارات کی زیارت کرنی تھی۔

ہم بستر پر دراز ہو گئے، ہر شخص تھکا ہوا تھا، حالات معمول پر تھے، کوئی نئی اور پریشان کن بات نہیں معلوم ہوتی تھی، میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے اپنے بھانجے مولوی محمد رابع سلمہٗ کو ہوٹل کے ایک ملازم سے ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے سنا۔

”وہ نیچے ہیں یا اوپر چڑھ آئے ہیں؟“

”نہیں وہ اوپر پہنچ گئے ہیں۔“ ہوٹل کے ذمہ دار نے جواب دیا۔

---

[1] یہ بزرگ ردالمحتار جس کو عام طور پر ”شامی“ کہتے ہیں، کے مصنف علامہ ابن عابدین کے ... پرپوتے ہیں، میڈیسن کے ڈاکٹر تھے لیکن اپنی دینی تعلیم، خاندانی ذوق اور ذاتی مطالعہ سے کئی سال تک مفتی جمہوریہ کے اہم عہدہ پر فائز رہے، دینی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

[2] شام کے مشہور شیخ طریقت اور استاذ و مربی شیخ علی الدقر کے فرزند جو شام میں متعدد دینی مدارس کے بانی اور علماء کی ایک کثیر تعداد کے استاد و مربی تھے۔

[3] شیخ زین العابدین شیخ محمد خضر حسین تونسی کے برادرِ اصغر جو مصر کی مشہور علمی و دینی شخصیت اور سابق شیخ الازہر تھے، بہت معمر بزرگ اور ذی استعداد عالم ہیں۔

اور پھر ہم نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنی، دروازہ کھول دیا گیا اور تین اشخاص جو شہری لباس میں تھے، کمرہ میں گھس آئے اور ہم سے کہا "سامان باندھئے اور تشریف لے چلئے!"

کہاں؟ ہم نے دریافت کیا۔

"معلوم نہیں" جواب ملا۔

اس کے بعد وہ استاذ احمد محمد جمال اور استاذ عبداللہ باجبیر سے ملے اور ہم کو ایک دوسرے سے ملنے سے روک دیا۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ کسی نئی صورت حال سے ہم دوچار ہونا ہے۔

استاذ احمد محمد جمال نے سعودی سفیر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو صورت حال سے آگاہ کریں مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی، استاذ نے اس غیر مہذب اور کرخت رویہ پر احتجاج کیا اور کہا کہ "ہم کوئی بھیڑ بکری نہیں ہیں کہ ہم کو زبردستی ہانکنے کی کوشش کی جائے، ہم سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں" مگر احتجاج بے سود رہا۔

پھر ہم ایک کار میں سوار ہوئے جو ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی، ہمارے ساتھ وہ لوگ بھی سوار ہوئے، اور راستہ میں ہم کو پتہ چلا کہ ہم لبنانی سرحدوں کی سمت جا رہے ہیں، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں لے جائے جا رہے ہیں۔

ساری کارروائیاں بڑی تیزی سے انجام پائیں، ہم ایک لبنانی کار میں منتقل ہو گئے جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے سے اسی مقصد کے لئے وہاں موجود تھی، اور ہم نے بیروت کا رخ کیا، بیروت صبح سویرے پہنچے، بیروت میں دوستوں کو جنھوں نے دو روز پہلے ہم کو رخصت کیا تھا، دوبارہ بیروت اچانک واپسی پر بہت حیرت ہوئی، اسی طرح دمشق میں

ہمارے احباب کو نصف شب میں اچانک شہر چھوڑنے پر خاصی تشویش اور حیرت ہوئی اور اس کی کوئی وجہ ان کو معلوم نہیں ہو سکی ۔

یہ سب کچھ ایک ڈرامائی انداز میں پیش آیا جس کے سین بہت مختصر تھے۔ ہمارے لئے تو یہ ایک خواب تھا جس کا آغاز بہت لذیذ اور جس کا انجام پریشان کن تھا۔ ہم گمان و یقین کی درمیانی کیفیت میں مبتلا تھے اور فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ سب کچھ عالم خواب میں پیش آیا یا عالم بیداری میں۔ اس میں ذمہ داروں کا اشارہ اور ارادہ شامل تھا یا ان کی لاعلمی میں پیش آیا۔

قرآن مجید میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے :-

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ	موسیٰ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب
مِّنْ أَهْلِهَا (القصص - ۱۵)	شہر کے سب لوگ نیند اور غفلت میں تھے ۔

ہمارا حال اس کے برعکس تھا۔ ہم شہر سے نکلے اس وقت جب سارے لوگ گہری نیند سو رہے تھے، اور کسی کو ہماری خبر نہ تھی۔

اس طرح دمشق کا دورہ بہت مختصر رہا، اور کتنی خواہشیں اور آرزوئیں تھیں جو ناتمام ہی رہ گئیں۔

بیروت کے اخبار الحیاۃ نے اس واقعہ کی خبر ۹ رجب سنہ ۹۳ھ مطابق ۶ اگست سنہ ۷۳ء کو دوشنبہ کے روز شائع کی اور اس سے بیروت میں ہمارے دوستوں کو اس واقعہ کا علم ہوا۔ اسی روز بی بی سی لندن اور اسرائیل ریڈیو نے بھی یہ خبر نشر کی اور بیروت اور دوسرے عربی ممالک کے اخبارات نے اس واقعہ پر تبصرہ کیا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

بیروت میں سارے دوست واحباب ملاقات کے لئے آتے، واقعہ کی تفصیلات دریافت کرتے، محو حیرت ہوتے اور مسئلے سے دلچسپی کا اظہار کرتے۔

ہارون رشید کے پایۂ تخت

بغداد میں

ترجمہ

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

اسلامی ثقافت و تاریخ میں بغداد کا مقام

اسلام کی سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا جتنا بڑا حصہ بغداد سے متعلق ہے، اتنا کسی دوسرے اسلامی شہر یا دارالسلطنت سے نہیں ہے، جتنے واقعات اور افسانے بغداد سے وابستہ ہیں، اتنے کسی دوسرے شہر سے وابستہ نہیں ہیں۔ بغداد اسلامی دور میں چمکا، پوری پانچ صدیوں تک عباسی حکومت کا دارالسلطنت رہا، زمانۂ قدیم میں متمدن دنیا کے بیشتر حصے پر حکمرانی کی، ہر علم و فن کے امام پیدا کیے، دنیا کے گوشے گوشے سے مختلف علوم و فنون کے ماہرین نے اس کا رخ کیا اور وہیں بود و باش اختیار کر لی، یہی وجہ ہے کہ ماہرین فن اور عظیم دانشوروں کی اتنی بڑی تعداد کا اجتماع کسی بھی دوسرے اسلامی شہر میں نہیں ہوا۔

بچپن میں دور دراز شہروں میں سے مکہ اور مدینہ کے بعد جس شہر کا نام سب سے پہلے کانوں میں پڑا، وہ بغداد ہی تھا، پہلی کتاب جس سے ہم نے حروف تہجی کی تعلیم حاصل کی وہ قاعدہ بغدادی تھی۔ یہ قاعدہ بغدادی ہی درحقیقت پورے اسلامی کتب خانہ کا دروازہ

قرآن وحدیث، اسلامی علوم وفنون اور اردو و فارسی زبانوں کی طرف لے جانے والا
راستہ ہے۔

اسلامی تاریخ (صرف ونحو) اور تینوں فقہی مکاتب فکر (حنفی، شافعی، حنبلی) کے مطالعہ میں جو راستہ اختیار کرتے تھے، وہ یا تو بغداد سے گزرتا یا بغداد ہی سے نکلتا یا بغداد ہی جاتا تھا، چنانچہ افکار و نظریات کے نشوونما، کوفہ و بصرہ، معتزلہ و اشاعرہ اور اسی طرح متکلمین و محدثین کے اختلافات کی جو تاریخ بھی لکھی جائے گی اس میں بغداد کا حوالہ اور اس کی جانب اشارہ ضروری ہے۔

یہیں وہ مقام تھا جہاں امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ابتلا پیش آیا تھا، جس میں آپ نے غیر معمولی صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا تھا، یہیں امام غزالی کے وہ حلقہ ہائے درس قائم ہوتے تھے جن پر خلفاء کی مجالس بھی رشک کرتی تھیں، یہیں علامہ ابن الجوزی کی وعظ و نصیحت کی مجلسیں گرم ہوتی تھیں جن میں اللہ کے نیک اور صالح بندے کثرت سے شریک ہوتے تھے، یہیں شیخ عبدالقادر جیلانی کا وہ مدرسہ تھا جو تعلیم و تزکیہ دونوں کا جامع تھا، یہیں زہد و تقویٰ اور عفت و پاکبازی کی وہ زندگی گزرتی تھی جس کی تصویر ہمیں ابو نعیم اصفہانی کی کتاب "حلیۃ الاولیاء" اور ابن الجوزی کی "صفۃ الصفوۃ" میں نظر آتی ہے، اور یہیں لہو و لعب اور رقص و سرود کی وہ آزاد اور رنگین زندگی بھی بسر ہوئی ہے جس کے نمونے ہمیں ابو الفرج اصفہانی کی کتاب "الاغانی" اور گمنام مولفین کی مشہور کتاب "الف لیلہ و لیلہ" میں ملتے ہیں، بغداد ان دونوں طرز کی زندگیوں اور دونوں قسم کے رجحانات میں قیادت و سربراہی کا مقام رکھتا تھا۔ مذکورہ کتابوں میں سے ہر کتاب بغداد کی اس متضاد زندگی کے ایک نمونہ کی ترجمانی اور تصویر کشی کرتی ہے، بغداد جہاں دولت دجلہ و فرات کی طرح بہتی تھی، جہاں خیر و شر دونوں کے محرکات

موجود تھے، جہاں "اصلاح" اور "فساد" دونوں کی دعوتوں اور تحریکوں کے علمبردار موجود تھے، ہر جگہ سے شہزادوں اور سلطنت پر قبضہ کی بیتابی تھی۔

—— تو بغداد کا سفر ضروری ہے خواہ کتنا ہی طویل ہو، اور یہی اندیشہ لاحق ہوا کہ خدانخواستہ یہاں بھی اسی حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑے جو دمشق میں پیش آیا تھا۔

بیروت سے بغداد

بغداد جانے والے طیارے کے انتظار میں ہم نے تین دن بیروت میں گزارے لبنانی طیارہ کا وقت دوشنبہ ۷ اگست ۷۸ء تھا، بیروت کے سعودی سفارتخانہ نے بغداد کے سعودی سفارتخانہ سے رابطہ قائم کیا اور بغداد کے سعودی سفیر نے سرکاری حلقوں سے رابطہ قائم کرکے ہمیں بتایا کہ عراقی حکومت وفد کو خوش آمدید کہتی ہے اور وہ دس دن تک وفد کی میزبانی کے لئے آمادہ ہے۔

دوشنبہ کے روز عشاء کے وقت ہم خدا کا نام لیکر روانہ ہوئے اور تقریباً نصف شب میں بغداد پہنچے، سعودی سفیر جناب علی عنقری، عراقی مجلس اوقاف کے نائب صدر عبداللہ تیقی، علماء بغداد کی ایک جماعت اور سعودی سفارتخانہ کا عملہ ہمارے استقبال کے لئے ہوائی اڈہ پر موجود تھا، ایک گھنٹہ تک ہوائی اڈہ کے استقبالیہ ایوان میں رہے جہاں حضرات علمائے کرام سے تعارف ہوا، ان میں سے بیشتر اوقاف سے متعلق تھے نیز بغداد کے امام وخطیب اور مدارس کے اساتذہ تھے، پھر ہم نے امبیسڈر ہوٹل کا رخ کیا، یہ دجلہ کے سامنے شارع ابونواس پر ایک عظیم الشان ہوٹل ہے، بغداد میں شدید گرمی تھی باد سموم کے تند جھونکے چل رہے تھے لیکن ہوٹل ایرکنڈیشنڈ تھا اس لئے رات بڑے سکون اور آرام سے گزری۔

سرکاری ملاقاتیں اور دورے

دوسرے روز ۸ راگست ۷۳ء کو چہارشنبہ کی صبح کو دفتری سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ پہلے دیوان الاوقاف گئے، وہاں معلوم ہوا کہ ہمارا پروگرام جس کی روشنی میں ہم کو نقل و حرکت کرنا ہے، وزارت خارجیہ مرتب کرے گی، وہی ملاقاتوں اور دوروں کا تعین کرے گی، وزارت خارجیہ نے ہمارے لئے ایک رفیق سفر مقرر کیا، یہ وزارت ہی کا ملازم تھا، اسی کی رفاقت اور نگرانی میں ہم کو چلنا پھرنا تھا، بعد میں محسوس ہوا کہ حکومت کی جانب سے دو اشخاص اور بھی متعین ہیں جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں۔

دیوان الاوقاف سے قصر جمہوری گئے، یہاں "سجل التشریفات"[1] میں اپنا نام درج کرایا، ہمارے سرکاری رفیق سفر نے بتایا کہ اس کا قوی امکان ہے کہ صدر جمہوریہ احمد حسن بکر ملاقات کے لئے ہم کو بلائیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ بغداد سے باہر کہیں کا سفر نہ کیا جائے۔

سب سے پہلے ہم نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی مسجد کی زیارت کی، ظہر کی نماز ادا کی، امام صاحب کے وفادار اور لائق شاگردؒ اور فقہ حنفی مسلک کے اہم ستون امام ابو یوسفؒ کی مسجد دیکھی، عصر کے بعد سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی زیارت کے لئے "حضرۃ القادریۃ"[2] گئے، آپ ہی کی مسجد میں نماز مغرب ادا کی، سیدنا جیلانی کی خانقاہ کے احاطہ میں ایک کتب خانہ بھی ہے، اسے دیکھا

---

[1] وہ رجسٹر جس میں پایۂ تخت میں آنے والے معزز مہمان دستخط کرتے ہیں، اور جو صدر جمہوریہ کے سامنے پیش ہوتا ہے، یہ مملکتوں کی ایک اخلاقی رسم ہے جو باہر سے آنے والے ممتاز اشخاص کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

[2] وہ جگہ جہاں شیخ عبد القادر جیلانیؒ بغداد میں مدفون ہیں، "الحضرۃ القادریۃ" یا "الحضرۃ الگیلانیۃ" کے نام سے مشہور ہے۔

اور پھر کچھ دیر کے لئے کاظمیہ[1] چلے گئے۔

جمعرات کی صبح کو بعض وزراء کی ملاقات کے لئے نکلے جن کا نام سرکاری پروگرام میں درج تھا، ان میں ابتدائی اور صنعتی تعلیم کے وزیر استاذ احمد الجبوری اور اعلیٰ تعلیم کے وزیر ڈاکٹر حسین الشاوی تھے، موخرالذکر وزیر حال ہی میں ہندوستان کے دورے سے واپس آئے تھے، گفتگو کا موضوع تھا: "ایک عرب اسلامی ملک کے لئے صحیح تعلیمی پالیسی کیا ہے؟" مثلاً عراق میں جو اسلام کی دعوت و اشاعت کا مرکز رہا ہے، اور جسے پورے عالم اسلامی میں علمی و فکری قیادت کا مقام حاصل تھا، دونوں کی گفتگو صحتمند اور شائستہ تھی، گفتگو میں نادانستہ طور پر چند لفظ ایسے بھی نکل پڑے تھے، جو اس قوم کی شخصیت اور اس عظیم علمی اور تہذیبی ملک کے تابناک ماضی کے عشق کی غمازی کرتے تھے، احساسات و جذبات کو دبانے، ماضی کے اثرات کو ختم کرنے اور زندگی کے مخصوص حقائق کو نظر انداز کرنے کی کوئی کوشش آج تک پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکی، یہاں تک کہ روس میں بھی اس طرح کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں، اس لئے کہ یہ فطرت سے نبرد آزمائی اور حقائق سے انکار ہے۔

دیوان الاوقاف کے اعزازی جلسہ میں

دیوان الاوقاف نے جس کے قائم مقام صدر شیخ عبدالرزاق قیاض تھے (صدر باہر کے دورہ پر گئے ہوئے تھے) وفد کے اعزاز میں جامع الشہداء میں ایک عشائیہ دیا جس میں بغداد کے علماء، مساجد کے ائمہ اور واعظین و مشائخ کی خاصی تعداد شریک تھی، بعض اہم شخصیتیں

---

[1] امام موسیٰ کاظم اور ان کے پوتے محمد تقی الجواد کا مدفن ہے، یہ دونوں حضرات شیعہ کے نزدیک اثنا عشری ائمہ میں شمار ہوتے ہیں، یہ مقام کاظمین کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

سابق مفتی عراق شیخ نجم الدین واعظ اور مدرسہ عبد القادر جیلانی کے استاذ شیخ عبد الکریم موجود تھے، وقت کے بیشتر حصہ میں خاموشی چھائی رہی، اگر کسی نے کچھ کہا تو بس بقدر ضرورت، مگر ان کی خاموشی گفتگو سے زیادہ بلیغ اور صورت حال کی عکاس تھی، ان کے روشن چہروں کی لکیریں اور ان کی ذہین آنکھوں کی چمک جیسے کہہ رہی ہو کہ اگر یہ پہرہ دار موجود نہ ہوتے جو ہماری سانسوں کو گنتے اور ہمارے الفاظ کو ریکارڈ کرتے ہیں تو آپ کے ساتھ ہمارا رویہ کچھ اور ہوتا، گویا زبان حال کہتی تھی:

گفتگو آئین درویشی نہ بود
ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

کچھ آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اور کچھ سینوں میں الفاظ کا ہیجان نظر آیا، بیچارے سب متنبی کا شعر پڑھ رہے تھے:

الحزن يقلق والتجمل يردع
والدمع بينهما عصيّ طيّع

ترجمہ: "غم قلق انگیز ہے اور صبر و وقار دامن گیر، اور آنسو ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہے۔"

یک حرف کاشکے ست کہ صد جا نوشتہ ایم

رمادی عراق کا ایک علمی اور دینی مرکز ہے، وہاں کے علماء کا ایک وفد ہماری ملاقات کے لئے آیا اور رمادی آنے کی دعوت دی تاکہ وہاں وہ اپنے اسلامی جذبات اور دینی احساسات کا بے تکلف اظہار کر سکیں اور ہمیں ان کی علمی و دینی سرگرمیوں سے واقفیت ہو نیز اس شہر کی

زیارت کی سعادت بھی حاصل ہو جو بہت سے علماء و مشائخ کا مرکز رہا ہے، ہم نے ان کے اس پاکیزہ اور نیک جذبہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا ہمارے لئے کوئی مانع نہیں ہے بشرطیکہ وزارت اوقاف کی منظوری حاصل کر لی جائے جس نے ہمارا پروگرام مرتب کیا ہے۔ اندازہ ہوا کہ انھیں اپنے شہر میں ہم سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا شدید اشتیاق تھا چنانچہ انھوں نے وزارت سے رابطہ قائم کیا اور درخواست کی کہ ان کو اپنے شہر میں اپنے علمی اور دینی بھائیوں اور رابطہ عالم اسلامی کے وفد کو ـــــ جس کے دورہ کی نوبت ایک طویل وقفہ کے بعد آئی ہے ـــ دعوت دینے کا موقع دیا جائے، اپنی اس خواہش اور جذبہ کے جواز کے لئے اور سند کے طور پر انھوں نے ایک نظیر بھی پیش کی کہ جب ضیاء الدین بابا خانوف جو روس کے جلیل القدر علماء دین میں شمار ہوتے تھے عراق کے دورہ پر تشریف لائے تھے تو ان کو دعوت دی گئی تھی اور حکومت نے اس کی اجازت بھی دے دی تھی گویا اس طرح وہ رابطہ کے وفد کو دعوت دینے کے سلسلہ میں اپنے حق کے لئے دلیل پیش کر رہے تھے اور ان ذمہ داروں کے لئے دلوں کو نرم کرنا چاہتے تھے جنھوں نے باہر کے ایک عالم کو دعوت دینے کی اجازت دی تھی، اس مثال سے بہت سے حضرات کی جانب ہماری رہنمائی ہوئی، اور ہم ایک عجیب صورت حال سے کچھ دو چار رہے، اس کو سمجھنے میں بہت مدد ملی جو کسی کتاب یا بلیغ ترین عبارت سے سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی، بعد میں معلوم ہوا کہ بغداد کے لوگ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے، اور وزارت خارجہ نے ان کی دعوت منظور نہیں کی۔

ہم نے نجف کی زیارت کی خواہش ظاہر کی جو عراق بلکہ شیعی دنیا کا ایک اہم علمی تعلیمی مرکز ہے جہاں ہزاروں طلبہ جن کی بڑی تعداد ہندوستانی ہے، رہتے ہیں، اسی طرح کربلا و کوفہ جانے کی بھی درخواست کی گئی جواب میں کہا گیا، اندیشہ ہے کہ صدر جمہوریہ ملاقات کے لئے

طلب کریں اور آپ حضرات اس وقت شہر میں موجود نہ ہوں۔ جب بھی بغداد سے باہر کسی جگہ جانے کی درخواست کی جاتی یہی جواب ملتا اور یہی عذر پیش کیا جاتا۔ البتہ سلمان پاک[1] اور مدائن کے تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع ملا جو بغداد سے ۳۰ کیلو میٹر دور جنوب میں دجلہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہیں، اگرچہ یہ دورہ بھی سرسری رہا۔

شیعہ علماء کی ایک جماعت نے ہوٹل میں وفد سے ملاقات کی اور کچھ دیر تک ساتھ بیٹھے رہے، ہمارے دائیں اور بائیں گویا کہ ٹیلیفون مسلط تھے۔ ان علماء نے نجف اور کربلا کی زیارت کا شوق دلایا اور اس دورہ کی ضرورت، علمی و دینی اہمیت کا بھی ذکر کیا نیز کہا کہ وہاں کے علماء ہماری ملاقات کے مشتاق ہیں، ہم نے وہاں جانے اور وہاں کے علماء کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے کلی آمادگی ظاہر کی لیکن ہم نے کہا کہ ہم اس ملک میں بطور مہمان آئے ہیں آزاد نہیں ہیں اور بغداد سے باہر جانے کے سلسلہ میں وزارت کا عذر ہے کہ ممکن ہے عزت مآب صدر اپنی ملاقات سے مشرف کرنے کے لئے ہم کو طلب کریں اور اس وقت ہم بغداد میں موجود نہ ہوں جس کے نتیجہ میں اس ملاقات کی سعادت سے محروم ہو جائیں۔

بغداد یونیورسٹی، المجمع العلمی العراقی اور المجمع العلمی الکردی میں

اس مختصر قیام کے دوران بغداد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سعد الراوی سے ملاقات ہوئی، یونیورسٹی کے مقاصد اور تعلیم کا موضوع زیر بحث رہا۔ ڈاکٹر صاحب بغداد یونیورسٹی کی ابتداء اس کی توسیع اور اس کے مختلف شعبوں پر گفتگو کرتے رہے، یہ ہمارے سرکاری پروگرام کی مقرر کردہ آخری ملاقات تھی۔

---

[1] وہ مقام جہاں حضرت سلمان فارسیؓ مدفون ہیں، انہیں کے قریب ذرا فاصلہ پر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا مرقد ہے۔

علمی اور ادبی ذوق نے ہم کو مجبور کیا کہ المجمع العلمی العراقی (عراق اکیڈمی) اور المجمع العلمی الکردی (کرد اکیڈمی) دیکھے جائیں جن کی علمی اور تحقیقی کوششوں کی ہم قدر کرتے ہیں، المجمع العلمی العراقی میں محقق عالم ڈاکٹر ناجی معروف جن کی تحقیقات، بلند پایہ علمی مقالے اور تصنیفات سے استفادہ کا موقع بھی ہم کو ملا تھا، مجمع کے صدر عبدالرزاق محی الدین، استاذ یوسف عزالدین اس کے جنرل سکریٹری فاضل طائی اور ہمارے پرانے دوست اور عراق کے اسلامی شاعر ولید الاعظمی نے ہمارا استقبال کیا، صدر مجمع اور ڈاکٹر ناجی معروف نے المجمع العلمی الکردی بھی دیکھنے کی فرمائش کی، دونوں اکیڈمیوں نے اپنی بعض مطبوعات ہم کو بطور ہدیہ پیش کیں۔

نئے تجربے

شارع متنبی پر واقع ایک بڑے مکتبہ میں گئے اور اپنی بعض تصنیفات تلاش کیں مگر ایک تصنیف بھی نہ ملی، یہ مکتبہ ان اسلامی کتابوں سے خالی نظر آیا جو اسلام کی سربلندی کا پیغام دیتی ہیں، ہم کو معلوم ہوا کہ اکثر وہ کتابیں یہاں ممنوع ہیں جو اس ملک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور احیاء کی دعوت دیتی ہیں، اور جن میں موجودہ حالات پر تنقید ہے، اس شہر میں جو مشرق عربی کا اہم ثقافتی مرکز ہے اور جس پر ایک ترقی پسند پارٹی حکمراں ہے جو فکر و رائے اور عقیدہ و ضمیر کی آزادی کی قائل ہے، یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے۔

سعودی سفارت خانہ نے وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا جس میں سفارت خانہ کا عملہ اور وہ حضرات شریک تھے جو ہماری رفاقت کے لیے مقرر کیے گئے تھے، یہی لوگ وزارت خارجہ اور عراقی حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے، علماء دین میں کوئی شخص مدعو نہ تھا

اور اپنے دینی و علمی بھائیوں سے ملاقات کے اشتیاق کے باوجود شریک نہ ہو سکا۔

عراقی میوزیم — تأثرات

۱۰ر اگست ؁۵۶ء جمعہ کے روز عراقی میوزیم دیکھنے گئے، ہماری رہنمائی کے لئے اس کے فاضل ڈائرکٹر موجود تھے، جو آثارِ قدیمہ کے ماہر ہیں، عراق کی تہذیب، تاریخ، معاشرہ اور حکومتیں ہزار سال قبل مسیح سے آج تک جن ادوار و مراحل سے گزری ہیں ان کا مشاہدہ کرایا، مثلاً بابلی دور، آشوری دور، سلوقی دور، فرثی دور وغیرہ، ہماری توجہ کا مرکز اسلامی عہد اور اسلامی آثار رہے اگرچہ اسلامی آثار بہت کم ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ہم کوئی تاریخی فلم دیکھ رہے ہوں جس میں ایک حکمراں آتا ہے، دوسرا جاتا ہے، ایک حکومت برسرِ اقتدار آتی ہے، دوسری زوال پذیر، ایک شہر آباد ہوتا ہے، دوسرا برباد، بلند اور پرشکوہ عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں اور چشم زدن میں ویرانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، یہ ساری چیزیں اس طرح گزر رہی تھیں، جیسے تاریخ کوئی ہزلیہ ڈراما (COMEDY) ہو جس میں حقیقت و واقعیت نام کو نہ ہو، جیسے کوئی ڈراما ہو جس میں کوئی بادشاہ کا کردار ادا کر رہا ہو کوئی وزیر کا، کوئی طاقتور کا، کوئی کمزور کا جیسے علی بابا یا الف لیلہ کے بغداد کے تاجر کا قصہ ہو، اور قصہ کے ماہر فن کار نے جس شخص کے حوالہ جو کردار کیا ہے، وہ ادا کر رہا ہے، کوئی کردار اس کے حکم سے انحراف نہیں کرتا، سب کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے، سب اس کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں، اور ہر شخص بھول جاتا ہے کہ وہ اپنے فعل میں مختار اور آزاد نہیں ہے، بلکہ مجبور اور پابند ہے، پھر آرزوؤں اور تمناؤں میں کھو جاتا، اور اپنے خیالی جزیروں میں گم ہو جاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ یہی کردار

ادا کرتا رہے گا، اور اس کی طاقت و قوت اور حکومت و سلطنت کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔

ان تاریخی معلومات اور ماہ و سال کی تیز رفتار تبدیلیوں سے میرا جی ڈوب گیا اور قوت و طاقت اور حکومت و دولت پر سے خواہ کتنی ہی وسیع، ہمہ گیر اور دیرپا نظر آئے میرا یقین و اعتماد جاتا رہا۔

ماضی کے کچھ نقوش اور یادیں

ہم نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقد کی زیارت کی اور شیخؒ کی مسجد میں ایک سے زیادہ مرتبہ نماز ادا کی۔ شیخؒ کا شمار امت اسلامیہ کے ان چند شخصیات میں ہوتا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے قبول عام اور بقا و دوام بخشا۔ ایسی شہرت و مقبولیت شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے شیخؒ کے وہ عظیم الشان کارنامے پھرنے لگے[1] جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت، معاصی کی روک تھام، نفوس کے تزکیہ، دعوت خلق اور خدا ہی سے امید و بیم کا رشتہ استوار کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئے[2]۔ میں سوچنے لگا، شیخؒ کی مجالس حاضرین و سامعین سے کیسے کھچا کھچ بھری رہتی تھیں، یہود و نصاریٰ کی جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام

---

[1] میں نے اپنی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول میں شیخؒ کے حالات اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

[2] لیکن بڑی ستم ظریفی ہے کہ جاہلوں نے آپ کی دین خالص اور صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کی دعوت اور سنت محمدیہ کی اطاعت سے کوئی سبق نہیں لیا اور آپ کی تعظیم میں ایسے طریقے اختیار کرنے لگے جو توحید اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں، مثلاً سجدہ کرتے ہیں، قبر کا بوسہ لیتے اور طواف کرتے ہیں، ہم کو ان غیر اسلامی مناظر سے سخت تکلیف ہوئی، ہم نے بعض ذمہ داروں کو توجہ دلائی کہ جاہلوں کو ان منکرات سے روکنا آپ کا فرض ہے، ہمارا خیال ہے کہ اگر وزارت اوقاف یا نقابت الاشراف اس کا عزم کرے تو کوئی مشکل کام نہیں ہے

ہوتے تھے۔ قاتل، رہزن اور عیار و شاطر افراد توبہ کرتے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے تھے، کس طرح دلوں میں نرمی، جذب کا ذوق، خشوع و انابت کی کیفیات پیدا ہوتی تھیں، پتھر موم اور دشمن دوست بن جاتے تھے۔

شیخ اگر اس وقت ہوتے

شیخ کا دور عباسی خلافت کے عروج کا دور تھا، اسلام کا بول بالا تھا، ساری دنیا مسلمانوں کے زیر نگیں تھی، لیکن اس کے باوجود شیخ بغداد اور عالم اسلام کی صورت حال سے مطمئن نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ اسلام میں ضعف اور مسلمانوں میں نفاق سرایت کر گیا ہے، اسلامی معاشرہ انھیں امراض میں مبتلا ہو گیا ہے، جو گزشتہ قوموں اور حکومتوں کی تباہی اور زوال کا سبب بنے یعنی مادہ پرستی، بوالہوسی، حب جاہ، خود غرضی، غیر اللہ کی غلامی، فضائل اخلاق اور اصل دین سے بے پروائی اور غفلت، بادشاہوں اور امراء کی خوشامد وغیرہ۔

میں نے اپنے دل میں کہا، شیخ اگر اس وقت تشریف رکھتے اور آج کا بغداد دیکھتے تو ان کے قلب حساس و درد مند پر کیا گزرتی، وہ ملاحظہ فرماتے کہ اہل زمانہ اور ابنائے وطن کس طرح بتان رنگ و بو کے پجاری اور حب دنیا کے زناری بن چکے ہیں، اسلام کی بجائے دوسری شریعتوں، دنیاوی مذاہب اور خود ساختہ نظامہائے حیات سے رشتہ جوڑ لیا ہے، اور کس طرح انھوں نے باہر سے زندگی کے طور طریق، حکومت کے انداز اور سیاسی و اقتصادی نظام درآمد کر لئے ہیں، شیخ جو عالی نسب ہاشمی خلیفہ کی بے راہ روی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور اس کے اخلاق و اعمال پر بے محابا تنقید فرماتے تھے، اس صورت حال کو کیسے گوارا کرتے کہ آج ایک عیسائی قائد[1] یا لیڈر جس کا اس ملک سے مذہب و نسب کا کوئی رشتہ نہیں ہے، ہارون رشید اور

---

[1] حزب البعث العربی کے بانی میشل عفلق کی طرف اشارہ ہے جو مذہباً عیسائی اور اصولاً قوم پرست اور اشتراکی

آج کے فرزندوں کے تخت پر جلوہ افروز ہے اور مشرقی مسلمانوں اور عربی النسل قوموں کو اپنے ڈنڈے سے اس طرح ہانک رہا ہے جیسے کوئی چرواہا بھیڑ بکریوں کے گلے کو ہانکتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر شیخ کا درد و کرب

مجھے یاد آیا کہ چھٹی صدی ہجری میں جب بغداد دعوت و اصلاح اور علم و ثقافت کا مرکز اور اسلامی ملک کے عہد یا ہر ہر جگہ ما فتور ہو چکا تھا، شیخ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا

> "دین محمدی کی دیواریں منہدم ہو رہی ہیں، اسلام کی بنیاد کھوکھلی ہو رہی ہے، آؤ اے اہل زمین! آؤ جو حصہ گر گیا ہے، اس کو اٹھا دیں، اور مرتب کر دیں۔
> اے آفتاب و ماہتاب! اور اے لیل و نہار! آؤ، لوگو! اسلام پر فریاد کرو!
> یہ ماتم کرنے کا موقع ہے، ان فساق و فجار، گمراہ و بدعتی، ظالم اور فریب کار لوگوں نے اسلام کو دل گرفتہ کر دیا ہے۔"[۱]

یہ درد مندی اور بے قراری اس زمانہ میں شیخ کو محسوس ہوتی تھی جو بڑی خیر و برکت کا زمانہ تھا تو آج اگر شیخ موجود ہوتے تو ان کی بے قراری کا کیا عالم ہوتا جب دیکھتے کہ مسلمان خود اسلام پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں، مذہب کو کارگہ حیات سے بے دخل اور بے تعلق کر دیا ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مسلمانوں کو جو صحیح علم حکیمانہ اور عادلانہ دستور زندگی اور انھیں کی زبان میں جو معجز کتاب عطا ہوئی تھی، اور آپ کی نبوت و قیادت کے سایہ میں انھیں جس شرف و سربلندی اور جس سرخروئی و ہر دلعزیزی سے نوازا گیا تھا، اس کی انھوں نے کوئی قدر نہ کی اور اس کو چھوڑ کر دوسرے مذاہب و ادیان اور دوسرے فلسفوں اور نظاموں کو اپنایا

---

[۱] الفتح الربانی ص ۶۲۱

سے رشتہ جوڑ لیا، ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمان یہاں سے آدھی دنیا پر حکومت کرتے تھے دنیا و آخرت دونوں کی سعادتوں سے بہرہ اندوز ہوتے تھے، اور اجسام و قلوب سب پر ان کی حکمرانی تھی، لیکن جب مسلمانوں نے اسلام کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا، تو ذلت و خواری اور ہلاکت و ادبار کے غار میں جا گرے۔

عراق انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد

ہم روزانہ شہر جاتے تو شارع رشید سے گزرتے جو ہمارے ہوٹل سے قریب ترین سڑک تھی، رصافہ اور کرخ کے درمیان چہل قدمی کرتے اور ان مقامات سے وابستہ اشعار و واقعات یاد کرتے، اس جسر (پل) سے گزرتے جو ان دونوں علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے اور وہ غزلیہ اشعار یاد کرتے جو اس جسر (پل) کے بارے میں کہے گئے ہیں، بعد میں متعدد نئے پل بھی تعمیر کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ دجلہ کو پار کرتے ہیں۔

اس سے پہلے ۱۹۵۶ء[1] میں بغداد آنا ہوا تھا، جب شاہ فیصل بن غازی کی حکومت تھی اور نوری السعید پاشا وزیر اعظم تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ کوئی مثالی دور نہیں تھا، اور نہ حکومت اسلامی نظام کے مطابق تھی، حکومت کی پالیسی، ذمہ داروں کی مطلق العنانی اور اس وقت کے حالات پر شدید نکتہ چینی کی گنجائش ہے، عوام اور حکومت کے درمیان ایک خلیج حائل تھی، ظلم و استبداد تھا، بدعنوانی اور مطلق العنانی تھی، عراقی حکومت برطانوی سیاست کے چشم و ابرو پر گھوم رہی تھی، یقیناً یہ صورت حال غلط اور قابل تنقید تھی، اگر حکام کا رویہ درست ہوتا اور اسلامی شریعت اور اس کے منصفانہ اصولوں پر عمل کیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ ملک اس سے زیادہ مضبوط

---

[1] بغداد کا سفر [illegible] کے نام سے مضمون ہے جو کتاب کے [illegible] (ابوالحسن علی)

مستحکم اور خوشحال ہوتا۔

لیکن جب میں بغداد کی سڑکوں پر گھومتا تھا، لوگوں کی باتوں کو سنتا اور ان کے چہروں کو پڑھتا تھا تو اپنے اس دو ہفتے کے بعض مخصوص تجربات کی روشنی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عبدالکریم قاسم کے انقلاب سے پہلے ملک زیادہ خوشحال اور مستحکم تھا، قوم میں آج سے زیادہ آزادی، بے فکری اور اطمینان تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں بغداد آیا تھا تو کسی طرح کے دباؤ، پابندی اور پہرہ کا احساس نہیں ہوا تھا، میں پوری آزادی سے بغداد اور بیرون بغداد گھومتا پھرتا تھا، جس سے چاہتا میں ملاقات کرتا اور جو چاہتا مجھ سے ملاقات کرتا، نہ کسی طرح کی باز پرس کا

أيا نهر عيسى لست لي بداري وإنما رماني إليك الدهر منذ ليالي
فهل فيك من ماء البصيرة قطرة تغيث بها ظمآن ليس بسالي

ترجمہ:- اے نہر عیسیٰ! اگرچہ میرا وطن نہیں ہے مگر زمانہ نے کچھ دنوں سے یہاں لاکر چھوڑ دیا، کیا تیرے پاس بصرہ کے پانی کی کوئی بوند نہیں ہے؟ جس سے تو ایک تشنہ لب کی پیاس بجھا سکے؟

اور بغداد کا قدیم محلہ ہے جو مشرقی بغداد رصافہ کے نام سے مشہور ہے، یہ نام ہارون رشید نے رکھا تھا، اور اس میں ایک محل بھی تعمیر کیا تھا، رصافہ کے بارے میں ابن الجہم کہتا ہے:

عيون المها بين الرصافة والجسر جلبن الهوى من حيث أدري ولا أدري
أعدن لي الشوق القديم ولم أكن سلوت ولكن زدن جمراً على جمر

ترجمہ:- غزال چشم حسینوں نے رصافہ اور جسر کے درمیان شعوری و غیر شعوری، معلوم نامعلوم طریقہ پر اپنی محبت کا اسیر بنا لیا۔

انھوں نے میرے قدیم شوق میں جو ابھی افسردہ نہیں ہوا تھا، ایک نئی تحریک پیدا کر دی، احساس خرابۂ محبت کو پھر آباد کیا اور فروزاں کر دیا۔

اندیشہ نہ ہوتا۔ جمعیۃ انقاذ فلسطین کے مرکز میں میری ایک تقریر ہوئی تھی جو بعد میں "ازمۃ الایمان والاخلاق" (ایمان واخلاق کا بحران) کے نام سے شائع ہوئی، اس تقریر میں نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، میں نے پوری آزادی سے تقریر کی تھی عراق اور عالم اسلامی کے اخلاقی انحطاط، موجودہ معاشرہ کے ایمانی اور اخلاقی بحران، باضمیر و با اصول افراد کے فقدان جیسے موضوع پر میں نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا، مگر سیاسی حلقوں میں اس تقریر سے کوئی کھلبلی نہیں مچی اور مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور بغداد سے اسی طرح آزاد و بے فکر اور مسرور و مطمئن آیا تھا جس طرح بغداد میں داخل ہوا تھا

انسان کی فطرت ہے کہ وہ نفع و نقصان، سود و زیاں اور کامیابی و ناکامی کے درمیان موازنہ کرتا ہے۔

تو آخر ان ملکوں کو ان ہولناک انقلابات سے کیا ملا جو حالات کو سدھارنے، قوم کو ظلم و استبداد کے آہنی پنجہ سے آزاد کرنے اور اس کی اس فطری حریت کو بحال کرنے کے لئے رونما ہوئے تھے۔

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ہم ان تمام لوگوں سے چاہتے ہیں، جو حقیقت پسند اور حق شناس ہیں اور جو عرب اسلامی ملکوں کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

جامع الشہداء میں خطاب

نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے دیوان الاوقاف نے ہمارے لئے جامع الشہداء کا تعین کیا تھا جو بغداد سے کئی کیلو میٹر دور ہے، اور اس شدید گرمی میں دوپہر کے وقت وہاں پہنچنے میں لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے، معلوم نہیں کیسے ہماری آمد کی خبر علماء اور مسلم نوجوانوں تک

پہنچ گئی جو اپنے دینی بھائیوں سے ملاقات کرنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق تھے چنانچہ مسجد نمازیوں سے بھر گئی اور مجھ سے متعدد آدمیوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں نماز بعد تقریر کروں میں نے ہر چند معذرت کی مگر بے سود آخر کار میں نے معاملہ ذمہ داروں پر ٹال دیا، مجھے اندیشہ ہوا کہ خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار بات پیش آجائے اور اس کا اثر ان دوستوں پر پڑے جنھوں نے تقریر کی خواہش کی تھی اور اسی لئے جامع مسجد میں تشریف لائے تھے، ذمہ داروں نے منظوری دے دی۔

میں سوچنے لگا؟ میری آج کی تقریر کا موضوع کیا ہو؟ مجھے محسوس ہوا کہ گفتگو کا دائرہ تنگ اور موقع نازک ہے۔ ایسے وقت میں قرآن نے میری دستگیری کی اور قرآن ہمیشہ ہی تھکے اور پریشان آدمی کی دستگیری... اور ..... رہنمائی کرتا ہے۔ اسے خدا کا الہام اور اس کی توفیق کہئے کہ استاذ عبدالرزاق فیاض نے اپنی شیریں اور گونجنے والی آواز میں نماز سے پہلے سورہ انبیاء کی تلاوت کی تھی میں نے اسی سورہ کی ایک آیت "لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ" کو لے لیا اور اس آیت کریمہ نے گفتگو کا ایک وسیع میدان میرے سامنے کر دیا، ایسی گفتگو جو دلوں کو چھوتی تھی، زندگی سے جس کا گہرا تعلق تھا، اور جو صورت حال پر منطبق بھی ہوتی تھی، میں نے کہا:

قرآن ایک صاف شفاف آئینہ ہے جس میں افراد و قومیں
اپنا چہرہ دیکھتی اور اپنا مقام پہچانتی ہیں

"حضرات!

میں نے ایک عزیز دوست سے سورۃ الانبیاء کی تلاوت سنی تو اس کی ایک آیت پر آکر

آیت نے میرے ذہن میں بے شمار معانی کے دریچے کھول دیئے۔ ارشادِ باری ہے

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ	ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب
ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝	نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے
(الانبیاء ۔ ۱۰)	تو تم غور کیوں نہیں کرتے؟

یہ آیت بھی یہ بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف شفاف، پاکیزہ اور بے داغ آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا ہے، معاشرہ میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کر سکتا ہے کیونکہ قرآن انسانوں کے اخلاق و صفات بیان کرتا ہے اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں۔ "فِيهِ ذِكْرُكُمْ" یعنی اس کتاب میں تمہارا بیان ہے، تمہارے حالات و اوصاف مذکور ہیں جیسا کہ بہت سے علماء نے سمجھا ہے۔ سلف قرآن کو ایک زندہ رہنے والی اور زندگی سے لبریز کتاب تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک قرآن کوئی تاریخی اور آثارِ قدیمہ کی چیز نہیں تھی جو صرف ماضی اور اگلے وقتوں کے لوگوں سے بحث کرتی ہو اور جس کا زندہ لوگوں سے، چلتی پھرتی انسانی زندگی اور انسانیت کے ان بے شمار افراد اور نمونوں سے جو ہر زمان و مکان میں موجود رہتے ہیں کوئی تعلق نہ ہو۔

ہمارے اسلاف اپنے اخلاق و اوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے، ہر چیز ان کے سامنے روشن اور عیاں ہوتی تھی، وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، اسی عجیب و غریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق و اطوار کی پکی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے، اور بہت آسانی سے خود اسی کتاب میں

پا جاتے تھے، اور پہچان لیتے تھے اگر کوئی خیر ہوتی تو خدا کا شکر ادا کرتے اور برائی ہوتی تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

اس آیت کی تلاوت پر مجھے سیدنا احنف بن قیس کا ایک واقعہ یاد آیا، احنف بن قیس کبار تابعین میں سے ہیں، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مخصوص ترین اصحاب میں ان کا شمار ہے، حلم میں ضرب المثل تھے، مگر اس کے باوجود جب غصہ ہو جاتے تو قرآن کی غیرت و حمیت میں جوش آ جاتا، لوگ کہتے تھے کہ جب احنف کو غصہ آتا ہے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں غضبناک ہو جاتی ہیں، یہ واقعہ میں نے ابو عبداللہ محمد بن النصر المروزی (متوفی ۲۹۴ھ) کی تصنیف "قیام اللیل" میں پڑھا ہے، مصنف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور گمان غالب ہے کہ اس کتاب کی تالیف آپ ہی کے شہر بغداد میں ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت احنف بن قیس تشریف فرما تھے کہ انھوں نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو چونک پڑے اور فرمایا، ذرا قرآن مجید لانا میں اپنا ذکر تلاش کروں، اور معلوم کروں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس سے مشابہ ہوں۔

قرآن مجید کھولا تو اس آیت پر نظر پڑی جس میں کچھ لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ	رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے
مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ	تھے، اور اوقات سحر میں بخشش مانگا

يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ	کرتے تھے، اور ان کے مال میں مانگنے
حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○	والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا
(الذاریات - ۱۷ - ۱۹)	حق ہوتا تھا۔

پھر یہ آیت گزری:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ	ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○	خوف و امید سے پکارتے ہیں، اور جو
(السجدہ - ۱۶)	مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے
	خرچ کرتے ہیں۔

پھر ان کے سامنے ایک گروہ آیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ	اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ
سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○	کرکے عجز و ادب سے کھڑے رہ کر راتیں
(الفرقان - ۶۴)	بسر کرتے ہیں۔

پھر ان کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ	جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ	کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اور
الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ	غصہ کو روکتے ہیں، اور لوگوں کے
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○	قصور معاف کرتے ہیں، اور خدا
(آل عمران - ۱۳۴)	نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

پھر ان کے سامنے کچھ لوگ آئے جن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے :

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ	اور دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	رکھتے ہیں خواہ ان کو خود تنگی
وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ	ہی ہو اور جو شخص حرص نفس سے
فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ۝	بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے
(الحشر ـ ۹)	والے ہیں۔

پھر یہ آیت سامنے آئی :-

وَٱلَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَٰٓئِرَ ٱلْإِثْمِ	اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی
وَٱلْفَوَٰحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا۟ هُمْ	کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور
يَغْفِرُونَ ۝ وَٱلَّذِينَ ٱسْتَجَابُوا۟	جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے
لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَ	ہیں، اور جو اپنے پروردگار کا فرمان
أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا	قبول کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور
رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝	اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے
(الشوریٰ ـ ۳۷ ـ ۳۸)	ہیں اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا
	ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر رک گئے اور فرمایا : اے اللہ یہاں تو میں اپنے آپ کو نہیں پاتا ہوں اور دوسری جگہ تلاش کرنا شروع کیا تو ایک جماعت کا تذکرہ دیکھا :

إِنَّهُمْ كَانُوٓا۟ إِذَا قِيلَ لَهُمْ	ان کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کہا جاتا
لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝	تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا
لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ
(الصّٰفّٰت - ۳۵-۳۶)

غرور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بھلا ہم
ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے کہیں
اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔

پھر ان کا ذکر گزرا:

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ
اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا
ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا
هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (الزمر - ۴۵)

اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے،
تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے
ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور
جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا
جاتا ہے، تو خوش ہو جاتے ہیں۔

پھر ان حضرات کا تذکرہ سامنے آیا جن سے سوال کیا جائے گا،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ
نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ
مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ
بِيَوْمِ الدِّينِ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ
(المدثر - ۴۲-۴۷)

(سوال ہوگا) تم دوزخ میں کیوں
پڑے، وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز
نہیں پڑھتے تھے اور نہ فقیروں کو
کھانا کھلاتے تھے اور اہل باطل کی
ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور روز جزا
کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ ہمیں
موت آ گئی۔

پھر مڑ گئے اور فرمایا اے معشر [illegible] ان لوگوں سے [illegible]
[illegible]

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ	اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا
خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا	اقرار کرتے ہیں، انہوں نے اچھے اور
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ	برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا قریب
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے
(التوبہ ۔ ۱۰۲)	بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔[1]

تو فرمانے لگے: خداوندا! میں انہیں لوگوں میں سے ہوں گا۔[2]

آئیے ہم بھی اپنا ذکر اور اپنی تصویر بڑی دیانت داری اور سنجیدگی سے قرآن میں تلاش کریں۔ قرآن بشیر بھی ہے اور نذیر بھی، صالحین کے ساتھ کفار و مشرکین کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے۔ قرآن افراد و جماعتوں دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے

ارشاد ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ	اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو
قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ	دنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم
اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ	ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر
اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى	خدا کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ
سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا	سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیر کر
وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ	چلا جاتا ہے[3] تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے

---

[1] آیت کا ترجمہ مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمہ قرآن سے برائے نام فرق کے ساتھ منقول ہے۔

[2] کتاب قیام اللیل طبع ملتان [illegible] صفحہ ۱۳۔

[3] بعض لوگوں نے "تولی" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے "جب اس کو حکومت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے"

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

(البقرۃ ۔ ۲۰۴ ۔ ۲۰۶)

تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے خوف کرو تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے۔ سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

پھر اس کے بعد ارشاد ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝

(البقرۃ ۔ ۲۰۷)

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور خدا بندوں پر بہت مہربان ہے۔

ایک جماعت کا ذکر اس طرح ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ

اے ایمان والو اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائیگا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دیگا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ
(المائدہ ۔ ۵۴)

مومنوں کے حق میں نرمی کریں، اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور خدا بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔

ایک دوسری جماعت کا تذکرہ اس طرح ہے:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا
(الاحزاب ۔ ۲۳)

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا، اس کو سچ کر دکھایا۔ تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انھوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

شکر اور احسان شناسی کی ترغیب دلاتے ہوئے قرآن انبیاء اور ان کے متبعین کا ذکر کرتا ہے، دوسرا ناشکری یا احسان فراموشی، غرور اور حسن سلوک کا جواب بدسلوکی سے دینے کی مذمت کرتے ہوئے۔ اور اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا	جنھوں نے خدا کے احسان کو ناشکری
قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝	سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے
(ابراہیم ـ ۲۸)	گھر میں اتارا۔

اور اس کی مثال ایک بستی سے دیتا ہے جس نے خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیا اور جس کے افراد اپنی خوشحالی پر اترانے لگے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً	اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا
كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا	ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ	تھی ہر طرف سے رزق بافراغت
فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا	چلا آتا تھا، مگر ان لوگوں نے خدا کی
اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ	نعمتوں کی ناشکری کی تو خدا نے
بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝	ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک
(النحل ـ ۱۱۲)	اور خوف کا لباس پہنا کر ناشکری
	کا مزہ چکھا دیا۔

یہ انسانی اور اخلاقی نمونے جو قرآن نے مختلف ناموں سے پیش کئے ہیں کہیں کسی مطلق العنان فرمانروا کے نام سے مثلاً فرعون، کہیں کسی سرکش وزیر یا امیر کے نام سے مثلاً ہامان، کہیں کسی متکبر اور بخیل سرمایہ دار کے نام سے مثلاً قارون، کہیں کسی ظالم و جابر قوم کے نام سے مثلاً عاد، کہیں کسی مشہور اور ماہر صنعت قوم کے نام سے مثلاً ثمود یہ تمام ادوار والے انسانی نمونے ہیں جو کسی

زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور یہ تمام نمونے انسانی فطرت کے مختلف کمزور پہلوؤں اور گوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے ان افراد و جماعتوں کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صفائی کے ساتھ کہا ہے کہ جو بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا اور ان کو اپنا پیشوا و قائد تسلیم کرے گا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان افراد و جماعتوں کا ہوا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ — جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی
وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَقْدُورًا — دستور رہا ہے اور خدا کا حکم مقرر ہو چکا ہے
(الاحزاب ۳۸)

تقریر ختم ہونے کے بعد حاضرین مصافحہ و معانقہ کے لئے ٹوٹ پڑے اور ایک نے میرے کان میں چپکے سے کہا: ہجوم اس قدر ہوتا اور پورا بغداد امنڈ آتا، اگر حالات معمول پر ہوتے اور لوگوں کو آزادی حاصل ہوتی:

بصرہ نہ دیکھنے کا افسوس

ہم نے بصرہ جانے کی درخواست کی جو قدیم تاریخ میں علم و تہذیب اور دعوت اسلامی کا اہم مرکز، اسلامی دور میں دمشق کے بعد سب سے بڑا شہر اور سید التابعین حسن بصری کا وطن رہا ہے، لیکن وہی کہا گیا جو سب جگہ کہا جاتا ہے، ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو تکلیف ہو، اور آپ لوگ خلیج کویت جاتے وقت ارادہ تھا کہ بصرہ میں رک کر وہاں سے عمان جائیں گے مگر موقع نہ ملا

بغداد سے روانگی

اتوار کی شام کو بغداد سے روانہ ہوئے، دل میں اس کی یاد اور اس کی محبت

چپکی سے رہی تھی اور زبان حال گویا تھی ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

شہیدوں اور پاسبانوں کی سرزمین

اردن میں

ترجمہ

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

بغداد سے عمان

چار عرب اسلامی ملکوں کے اس دورہ کی آخری منزل شرقِ اردن تھا اور غالباً یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اظہارِ خیال کی جتنی آزادی اور جتنا موقع وہاں حاصل ہوا وہ ان ملکوں میں قطعاً حاصل نہیں ہوا۔ یہاں کی حکومتیں جمہوریت و قومیت کی علمبردار ہیں اور جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان پر کوئی ایک فرد یا کوئی مخصوص خاندان حکمرانی کرے۔ ان کے نزدیک یہ رجعت پرستی اور پسماندگی کی علامت ہے جس کی اس آزاد و ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اتوار ۱۸ اگست ۶۸ء رات کو تقریباً ۸ بجے ہم بغداد سے روانہ ہوئے۔ ہم کو رخصت کرنے کے لیے سعودی سفیر اور بغداد کے بعض اساتذہ جو سعودی عرب میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، تشریف لائے تھے۔ بصرہ کے ہوائی اڈہ پر ایک گھنٹہ کے لیے اترے اس عظیم علمی اور تاریخی شہر کی زیارت کی اجازت نہیں مل سکی تھی، جو دین، علم اور ادب و نحو کا ایک مستقل مکتبِ فکر تھا۔ ہوائی اڈہ پر اچانک سعودی قونصل سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے

بہت اصرار کیا کہ ہم بصرہ میں ان کی میزبانی میں کچھ وقت گزاریں اور وہاں تاریخی شہر کی سیر کریں۔ اس غیر متوقع ملاقات سے ہم سب کو بہت مسرت ہوئی۔ پھر کویت کے لئے طیارہ پر سوار ہو گئے۔ رات کویت میں گزاری۔ شیرٹن (SHERATON) ہوٹل میں قیام کیا۔ جہاں شیخ عبدالرزاق صالح، ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللطیف خاں اور دیگر اعزہ بغرض ملاقات کے لئے آئے اور کچھ دیر ساتھ بیٹھنے کے بعد ہم کو آرام کرنے کے لئے چھوڑ گئے۔

دوشنبہ ۳ اگست کی صبح کو ہم نے عمان کا رخ کیا۔ اور ظہر سے پہلے پہنچے ہوائی اڈہ پر ہمارے استقبال کے لئے وزارت اوقاف کے سکریٹری استاذ عبد خلف، پاکستان میں اردن کے سفیر اور رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے رکن سید کامل الشریف، سعودی دار الہام استاذ محمد بسیش اور دوسرے حضرات موجود تھے۔ ہوائی اڈہ سے اردن کے مشہور ہوٹل انٹر کونٹیننٹل اردن ہوٹل لے گئے۔ راستہ میں سید کامل الشریف نے ہم کو بتایا کہ شاہ حسین کو جب وفد کے دورۂ اردن کی اطلاع ملی تو انہوں نے مسرت کا اظہار کیا، اور خوش آمدید کہا، اور توقع ہے کہ وہ کسی وقت وفد کو ملاقات کے لئے یاد فرمائیں۔ ہم نے اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا جس کا اظہار اس شریف خاندان سے کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

وزارت اوقاف کی میزبانی

اوقاف اور اسلامی امور کی وزارت کی میزبانی میں ہم نے ہوٹل میں قیام کیا جس کے نگران اور ذمہ دار ڈاکٹر اسحاق فرحان ہیں۔ وزارت اوقاف کی طرف سے ہر سال ایک تعلیمی و ثقافتی پروگرام چلایا جاتا ہے، حسن اتفاق سے ہمارا آنا اسی زمانہ میں ہوا جب اسلامی ثقافت کی اشاعت اور اسلامی شعور بیدار کرنے کے مختلف علمی مجلسیں منعقد کی جا رہی تھیں،

کمیٹی کے پروگرام تیار کئے جا رہے تھے جب ہم دمشق میں تھے، اسی وقت وزارت کے سکریٹری نے ہم سے ان ثقافتی تقریبات میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تھی، اور محترم وزیر ثقافت نے ہندوستان میں راقم سطور کی قیام گاہ پر دعوت نامہ بھی ارسال کیا تھا، وفد کے دوران کے موقع کو وزارت نے غنیمت جانا، اور وفد کو اپنا مہمان بنایا، خطابات، ملاقاتوں اور دوروں کا پروگرام مرتب کیا، اور اسے شائع کیا۔

محترم وزیر اوقاف نے ہوٹل میں ہم سے ملاقات کی، آپ مشرق عربی کی گنی چنی تعلیمی و تربیتی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، اور اسلامی فکر اور اسلامی ذہن رکھتے ہیں، اس سے پہلے تعلیم و اوقاف کی ایک ہی وزارت تھی، بعد میں دو مستقل وزارتیں بنا دی گئیں، ہم نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے اسلامی مضامین کے ذریعہ جانا، اسلامی ملکوں میں تعلیم و تربیت کے انداز کے موضوع پر ان کے بعض مقالات ہمارے نزدیک بڑے فکر انگیز ہیں، وزارت میں ان کا وجود ملک کے لئے ایک گراں مایہ نعمت سے کم نہیں، اگرچہ ان کا قدرتی اور صحیح مقام وزارت تعلیم ہی ہے، اسی طرح اطلاعات و نشریات کے ڈائرکٹر استاذ علی فریج، ڈاکٹر عبداللہ عزام ــــ جو وفد کے رفیق مقرر ہوئے اور اس دورہ میں جس کا آغاز کابل اور جس کی آخری منزل عمان تھا، جن دوستوں سے تعارف حاصل ہوا ان میں دینداری، تقویٰ، غیرت و حمیت اور چستی و سرگرمی ہر اعتبار سے بہت ممتاز تھے ــــ نیز وزارت کے ڈائرکٹر جنرل استاذ عزالدین خطیب و ہفتہ وار اللواء کے ایڈیٹر استاذ حسن التل نے شرف ملاقات بخشا۔

محترم وزیر اوقاف اور ان کے رفقاء کے ساتھ

وفد نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز شنبہ کے روز ۱۳ اگست ۷۳ء کو ۹ بجے صبح

اسلامی امور کے وزیر سے ان کے دفتر میں ملاقات سے کیا، دو گھنٹے کی ملاقات رہی، وزیر موصوف نے وزارت اوقاف کی سرگرمیوں، امور کے میدان کار اور اخیر دور میں اس کے ارتقاء اور تبدیلیوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے وزارت اوقاف کی سرگرمیوں کا میدان فوت شدہ اشخاص کے مسائل تھے اب اس نے زندگی اور زندہ لوگوں کے مسائل کو بھی اپنے دائرۂ عمل میں شامل کر لیا ہے، اور مذہبی تعلیمات اور اسلامی ثقافت سے ان کا رشتہ استوار کر رہی ہے، ان کی گفتگو میں پختگی اور بیدار مغزی نمایاں تھی، وہ اسلام اور علم کے پیغام کا فہم اور روح عصر کا شعور رکھتے ہیں، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ وقت کے فقہی احکام و مسائل میں لچک پائی جاتی ہے، وہ زمانہ کا ساتھ دے سکتے ہیں، اور کتاب و سنت اور وسیع فقہ اسلامی کی روشنی میں مسلمانوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں، محترم وزیر نے اپنی گفتگو میں وزارت کے انتظامی ڈھانچہ اور وزارت کے تحت چلنے والے اداروں کا مکمل اور تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا جس سے مختصر وقت میں ہم کو خاصی معلومات حاصل ہو گئیں اور اس وزارت کے متعلق ایک واضح اور مرتب نقشہ سامنے آیا جو قدیم اسلامی سرمایہ کے تحفظ اور جدید سرمایہ میں اضافہ کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

گیارہ بجے "معہد شرعی" دیکھنے گئے اور اس کے ناظم شیخ محمد ابراہیم شقرہ سے ملاقات کی جن کا شمار اس اسلامی ملک کے ممتاز علماء اور اہل فکر میں ہوتا ہے، وہ عقائد کی پختگی کے ساتھ ایک روشن خیال عالم، اور ایک خوش بیان مقرر بھی ہیں، مدینہ یونیورسٹی میں عرصہ تک معلم رہ چکے ہیں، معہد شرعی سے ملحق "مدرسۃ القرآن" دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔

شاہ حسین سے ملاقات

اس کے بعد اسلامی ثقافتی مرکز —— عورتوں کی شاخ —— جانا تھا ظہر کا وقت ہو چکا تھا ہم معہد شرعی سے ملی ہوئی مسجد میں نماز ظہر ادا کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک شاہ حسین نے فوری طور پر قصر شاہی میں ملاقات کے لئے طلب کیا، ہم نے نماز ظہر ادا کی پھر وزیر اوقاف کے دفتر گئے جہاں سے سید کامل الشریف کی معیت میں —— جن کو قصر تک وفد کے رفیق اور رہنما کی حیثیت سے جانا تھا —— قصر شاہی کا رخ کیا۔

محل میں داخل ہوئے تو وہاں سعودی عرب میں اردن کے سفیر شیخ محمد امین الشنقیطی سے ملاقات ہوئی جو حال ہی میں شاہ سے ملاقات اور دارالحکومت کے دورے پر آئے ہوئے تھے، ان کی موجودگی سے ہم کو موجودہ شاہ کے دادا ملک عبداللہ بن حسین مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات جو ۲۴ سال پہلے رغدان کے محل میں دو شنبہ کے روز ۶ شوال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ہوئی تھی اور دوسری ملاقات کی —— جو ۹ شوال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ہوئی —— یاد تازہ ہو گئی۔ اور آج ہم ان کے نامور پوتے سے ملاقات کر رہے تھے لیکن آج اور کل کے درمیان کتنا گہرا اور عظیم فرق ہے؟

۲۴ سال کا وقفہ ریاضی کے اعتبار سے ایک مختصر وقفہ ہے، اور اشخاص، قوموں، خاندانوں اور حکومتوں کی زندگی اور تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، تھوڑی سی مدت یا کبھی کبھی کئی نسلیں گزر جاتی ہیں، حکومتیں تبدیل ہو جاتی ہیں، اگر حوادث و انقلابات، سود و زیاں اور دنیا خصوصاً اس ملک کے سیاسی اور جغرافیائی نقشہ کی تبدیلیوں کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو یہ ایک طویل وقفہ نظر آتا ہے۔

شاہ حسین کو اپنے جدِ امجد سے وراثت میں ایک ایسی مملکت ملی ہے جس کو بہت سے ایسے خلیجی مسائل اور تضادات کا سامنا ہے جن سے اس دور میں شاہ کی حکومت اور مملکت کو واسطہ ہے۔ ان کے عصر میں قیادت و سربراہی کے لئے بہت نازک اور پیچیدہ وقت آیا ہے۔ یہ بارِ گراں غیر معمولی سوجھ بوجھ اور زبردست فہم و بصیرت رکھنے والے لیڈر ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جب میں استقبال کے کمرے سے انتظار کے کمرہ اور وہاں سے شاہ کے دفتر میں جا رہا تھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں کوئی ڈراما یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ انسان کی بے بسی، زندگی کی بے ثباتی اور زمانہ کی نیرنگیوں پر یقین بڑھتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے جب میں اردن آیا تھا تو اپنے معزز میزبان شیخ قاسم المصری تاجر عمان کے گھر میں دسترخوان پر تھا کہ اچانک شاہ عبداللہ کا فوری پیغام پہنچا اور مجھ سے کہا گیا: "سیدنا[1] آپ کو بلا رہے ہیں" میں نے فوراً شاہ کی دعوت پر لبیک کہا۔ پھر دوسری بار جامع مسجد میں جہاں شاہ نے نماز ادا کی تھی اچانک شاہ کا پیغام پہنچا اور کہا گیا کہ: "سیدنا آپ کو بلا رہے ہیں" ــــ اور آج ان کے نامور پوتے کا اچانک پیغام پہنچا اور ہم سے کہا گیا: "سیدنا آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔ آج اور کل میں کتنی مشابہت ہے۔ مگر ماضی اور حال میں کتنا زبردست اور نمایاں فرق ہو چکا ہے۔

ہم شاہ کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہ چند قدم ہمارے استقبال کے لئے بڑھے دروازہ کھولا، بہت تواضع اور انکساری سے ملتے آئے اور معذرت کی کہ وہ ہم سے اسی پوشاک میں مل رہے ہیں، جس میں وہ تھے۔ پھر بالکل بے تکلفی سے ہم بیٹھے اور بڑی سادگی اور صفائی کے ساتھ گفتگو کی۔ شاہی رسوم و آداب کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ گفتگو ملک کی

---

[1] اردن کے لوگ اپنے شاہ کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے ہیں جس کو انھوں نے حجاز سے اخذ کیا ہے اور یہی لفظ رائج ہو گیا ہے۔

اس نازک پیچیدہ اور پریشان کن صورت حال تک پہنچی جس میں ذہانت دور اندیشی، پختہ ایمان اور سچے ارادے اور آہنی عزم کا امتحان ہے، اور جس کی بہترین تصویر یہ آیت کریمہ پیش کرتی ہے

حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (التوبہ — ۱۱۸)

یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی، اور ان کی جانیں بھی ان کو دوبھر ہو گئیں اور انھوں نے یہ جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اسی کے سوا کوئی پناہ نہیں۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عملی طور پر تجربہ بھی کیا کہ مسلمانوں اور عربوں خصوصاً اس ملک کے لئے جو شیر کے جبڑوں یا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان واقع ہے، اور نوک شمشیر و سنان پر زندگی گزار رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ملجا و ماویٰ اور کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے، اگر اس کے لئے کوئی راہ نجات ہو سکتی ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں میں ایمان راسخ ہو، اسلام کے لئے اخلاص ہو، اس حقیقت پر غیر متزلزل یقین و اعتقاد ہو کہ اسلام ہی زندہ رہنے اور انسانیت کی رہنمائی کرنے کا اہل ہے، زندگی ان تمام آلائشوں اور خرابیوں سے پاک ہو جو اسلام کی سربلندی اور سرخروئی کی راہ میں رکاوٹ اور اس کے زوال و انحطاط کا باعث ہوں، اسلام کو غیر مشروط طور پر زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں میں اسی طرح نافذ اور جاری و ساری کیا جائے جیسا کہ قرآن حکم دیتا ہے، خدا اور اس کے رسول کو دعوت مبارزت نہ دی جائے، اور اس آیت کریمہ پر ایمان لایا جائے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ — ۱۲۰)

اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی، یہاں تک کہ ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو۔

میں نے شاہ حسین کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو فلسطینی پناہ گزینوں، ان کے اور ان کی آئندہ نسلوں کے عقائد کے بارے میں شاہ پر عائد ہوتی ہے، کیسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ فلسطینیوں کو عیسائی مبلغین اور یہودی ریلیف کمیٹیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے جو ان کی زبوں حالی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا: "یہ عظیم ترین ذمہ داری ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، ہم سب ایک روز اللہ تعالے کے حضور کھڑے کئے جائیں گے، اور ان مصیبت زدہ اور قابل رحم لوگوں کے بارے میں ہم سے باز پرس ہوگی جو اپنے وطن سے صرف اس بنا پر نکالے گئے کہ انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار تو بس اللہ ہے۔" اسی کے ساتھ میں نے شاہ کے بعض جرأت مندانہ اور دانشمندانہ اقدامات کا اعتراف کیا، اور بعض مواقع پر ان کی بے نظیر شجاعت وجرأت کو سراہا۔

میں نے شاہ سے کہا: ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ اگر میرے پاس صرف ایک ہی دعا ہوتی جسے اللہ تعالے شرف قبولیت سے نوازتا تو وہ دعا میں حاکم شہر کے لئے کرتا، اس لئے کہ اگر وہ صالح ہے تو سارا شہر صالح ہوگا، لیکن اگر اس میں خرابی ہے تو سارا شہر خراب ہو جائے گا میں اگرچہ اس مرتبہ پر نہیں ہوں، لیکن میں یہی بات شاہ سے کہنے کی جسارت کرتا ہوں"۔

شاہ خاموشی اور انکساری سے باتیں سنتے رہے۔ گفتگو میں رفیق محترم استاذ احمد محمد جمال اور سید کامل الشریف بھی شریک تھے۔ استاذ احمد محمد جمال نے کہا: میں نے بہت سے موقعوں پر کہا ہے کہ ہماری تمام تر امیدیں شاہ فیصل اور شاہ حسین سے وابستہ ہیں"۔

مجلس برخاست ہوئی تو شاہ ہم کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور آئے، پھر ہم نے سلام کیا اور ہوٹل میں اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

شہر کے اسلامی اداروں کا دورہ

۱۵؍ اگست ۸۵ء کو پنجشنبہ کے روز صبح ۹ بجے نکلے اور اس عظیم فلاحی اسلامی اسپتال کی عمارت دیکھنے گئے جو عمان میں فلاحی اسلامی مرکز کی انجمن کی جانب سے قائم ہو رہا ہے، یہ ایک زبردست منصوبہ ہے، اگر مکمل ہو گیا تو یہ اسپتال اس عرب اسلامی علاقہ کا عظیم ترین اسپتال ہوگا، اور اس شہر کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرے گا، جہاں ہر طرف عیسائی مشنریاں اور مغربی عیسائی ادارے اسپتال قائم کرکے اور طبی امداد فراہم کرنے میں سرگرم عمل ہیں، اور جو عیسائی تبلیغ کا اہم مرکز رہا ہے، جہاں ایک نازک اور حساس گوشہ سے دلوں میں گھر کرنے اور ذہنوں کو مائل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، یعنی مریض پر شفقت اس کی دلجوئی، اس کی تکلیفوں کا ازالہ یا کم سے کم ان میں تخفیف اور لطیف و شیریں انداز گفتگو جو دلوں کو چھوتا ہوا اور مسحور کرتا ہو، بلاشبہ یہ انسان کی زندگی کا کمزور ترین اور نازک ترین گوشہ ہے۔

یہ اسپتال تعمیر و تزئین کے اکثر مراحل سے گزر چکا ہے، استاذ محمد عبدالرحمٰن خلیفہ اور ان کے معاون استاذ مشہود ترین محمود ریاح جو اسپتال کے بانی اور انجمن کے جنرل ڈائرکٹر ہیں، اسپتال کے مختلف حصوں میں ہم کو لے گئے، اور تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کہ کس طرح یہ منصوبہ کامیاب ہوا، اور کس طرح ماہر فن معماروں اور عالمی شہرت کے مالک اطبا کی خدمات حاصل کی گئیں، اسپتال جدید ترین طرز پر تعمیر کیا جا رہا ہے، ترقی یافتہ ترین ساز و سامان فراہم کئے جا رہے ہیں، اسی سے ملحق ایک بڑی مسجد، کلچرل سنٹر، بچوں کے لئے ہال، اسلامی لائبریری، نرسوں کے لئے کوارٹر، اور نرسوں اور قابلات کی تربیت کا مدرسہ بھی ہوگا

اس سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے اردن یونیورسٹی کی مسجد دیکھی جو اگرچہ ابھی تعمیر
تکمیل کے مرحلہ میں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد شاندار اور اس اہم مرکز کے شایانِ شان
ہوگی جس میں اثر قبول کرنے کی بہت صلاحیت ہے۔ عمان کے ادارہ اوقاف بھی گئے اور
اہم ذمہ داروں کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ مکتبۃ المسجد الاقصیٰ دیکھا۔ اس دورہ میں جن جگہوں
کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اسلامی کتابوں سے بھرا ہوا ہے
ہماری اکثر تصنیفات جو بیروت و قاہرہ میں شائع ہوئی ہیں اس کتب خانہ میں موجود تھیں۔

اسی طرح مسجد احمد قدرہ کی زیارت کی جو دارالحکومت کی مرکزی مسجدوں میں
شمار ہوتی ہے، نماز کے پانچوں اوقات میں اس ایک مسجد سے اذان نشر کی جاتی ہے یہ نیا خیال
ہے جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ اقدام بحث و تنقید کی بڑی گنجائش رکھتا ہے کیونکہ
اگر اتفاق سے کسی وقت اس سسٹم کا لنک بیکار ہو جائے، یا مؤذن سو جائے تو سارے شہر کے
لوگ اذان سے محروم رہ جائیں گے۔ مزید برآں اذان کی جو فضیلت ہے، اور اذان دینے پر
عند اللہ جو ثواب ہے اس سے شہر کی باقی مسجدیں محروم ہو جاتی ہیں۔ اس مسجد کے مختلف حصوں
کو دیکھا، اس کی لائبریری بھی دیکھی، جو جدید طرز پر مرتب کی گئی ہے، عمارت کی دلکشی اور
نظم و نسق کی خوش سلیقگی سے مسرت ہوئی۔

یتیم خانہ کے منصوبے کے لئے جو زمین تجویز کی گئی ہے۔ وہ بھی دیکھی، اسی کے پاس
قصبات اور دیہاتوں سے آنے والے حاجیوں کے استقبال اور ٹھہرنے کا مرکز بھی ہے۔

فلسطینی پناہ گزینوں پر ایک نظر

راستہ میں ایک فلسطینی کیمپ سے گزر ہوا، ہم نے دیکھا کہ فلسطینی بچے جن کے آبا و اجداد

کا اسلامی فتوحات اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں نمایاں کردار رہا ہے، افلاس اور بدحالی کا شکار ہیں، ان کی حالت کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، یہاں جبرین عنتری ونشنفر کا مرکز دیکھا جو دوا، فرسٹ ایڈ، غذا کی سپلائی اور تعلیم و تربیت کے مختلف شعبوں پر مشتمل ہے، ہم نے کہا: اب بھیڑیوں اور بھیڑوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے، دونوں کو قسمت کے حوالے کر دیا گیا ہے، بھلا بھوکی لاغر اور مسکین بھیڑیں اس طاقتور، فربہ اور خون آشام بھیڑیے کے سامنے کیسے زندہ رہ سکتی ہیں جبکہ دونوں اپنی اپنی فطرت پر ہیں۔

مرکز اسلامی کے استقبالیہ جلسہ میں

شام کو مرکز اسلامی کی فلاحی انجمن دیکھنے گئے، جو درحقیقت اخوان المسلمین اور ان کے بچے کچھے داعیوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے، اس کے نگراں ہمارے دیرینہ دوست اردن کے ممتاز لیڈر استاذ محمد عبدالرحمن خلیفہ ہیں، اس صدی کی پانچویں دہائی میں دعوت اسلامی کے جن اہم کارکنوں سے ہمارا تعارف ہوا ان میں ایک استاذ خلیفہ بھی ہیں، ہماری ان سے پہلی ملاقات دمشق میں ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی، وہ موتمر اسلامی میں شرکت کے لئے دمشق آئے تھے جس کی دعوت ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان نے دی تھی، وہ ہم لوگوں کو حماۃ کی بستیوں اور اردن میں فلسطین پناہ گزینوں کے کیمپوں میں لے جاتے تھے، پھر وہ ہندوستان بھی ہمارے پاس آئے تھے، ہمارا چھوٹا سا گاؤں جو دائرہ شاہ علم اللہؒ کے نام سے معروف ہے، ان کے قدم سے مشرف ہوا، وہ ہمیں موتمر اسلامی کی شرکت کی دعوت دینے آئے تھے، جو چند ہی دنوں بعد عمان میں منعقد ہونے والی تھی، اس مرتبہ انھوں نے ہمارے اعزاز میں پہل کی اور انجمن کے مرکز میں ایک اعزازی اور تعارفی جلسہ

منعقد کیا جس میں وزیر اوقاف ڈاکٹر اسحاق فرحان، سید کامل الشریف، علماء، عمائدین، تعلیم یافتہ طبقہ اور دعوت اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک معتدبہ تعداد نے شرکت کی۔ سب سے پہلے استاذ محمد عبدالرحمن خلیفہ نے ایک پرجوش تقریر کی جس میں وفد کو خوش آمدید کہا، اور حاضرین سے وفد کے ارکان کا تعارف کرایا، وفد کے بعض ارکان سے اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کیا اور اس شہر کا جو مقام اور عالم اسلامی اور عالم عربی میں اسکی جو تاریخی حیثیت ہے اس کی وضاحت کی۔

ایک سرحدی اور برسرپیکار اسلامی ملک کی ذمہ داری

استاذ خلیفہ کے بعد میں کھڑا ہوا اور میں نے ایک تقریر کی جس کی روح اور خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

میں استاذ محمد عبدالرحمن خلیفہ کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ میرے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ یہ ایک بھائی کے دوسرے بھائی، اور ایک دوست کے دوسرے دوست کے ....

بارے میں اظہار خیال ہے جن میں جذبات و احساسات کی ہم آہنگی ہے، جو ہم عقیدہ اور ہم خیال ہیں، جو ہم نوا اور ہم آواز ہیں۔ خاص طور پر میں اس لئے اپنے فاضل دوست کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے اہل شہر و اہل دعوت کی اس منتخب اور دانشمند جماعت سے تعارف، اور تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کیا، یہی اس طویل سفر کا حاصل، اور اس کی حقیقی قدر و قیمت ہے،

ہم نے آثارِ قدیمہ اور تاریخی مقامات کی سیر کے لئے یہ سفر نہیں کیا ہے، بلکہ ہمارے سفر کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بھائیوں سے ملاقات کریں، ان سے گفتگو اور تبادلۂ خیال کریں۔

دوستو! اپنے عرب بھائیوں سے جو اس ملک میں رہتے ہیں، توقع تو یہی کہ وہ اسلام کی روشنی کو دور دراز ملکوں تک پہونچا چکے، اور انھوں نے جہادوں میں اپنا فرض ادا کیا، اور ہم برصغیر کے باشندے ان کے مرہونِ منت ہیں، کیونکہ انھیں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کی نعمت سے بہرہ مند فرمایا۔ آپ کا ملک ہمیشہ دعوتِ اسلام کا مرکز اور سرچشمہ رہا ہے، اور اس ملک کی تاریخ نے جو فتوحات کی تاریخ ہے، جہد و جہاد کی تاریخ ہے، اسلامی شجاعت و بسالت کی تاریخ ہے، ہم کو ہمیشہ ایمان و یقین، اسلام پر فخر و ناز، اسلام پر وقتاً فوقتاً ہونے والے حملوں، اور اسلام دشمن تحریکوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت، اور اس راہ میں ثابت قدمی، بلکہ مصائب و حوادث پر صبر کرنے کا حوصلہ بخشا ہے، ہماری مصیبتوں میں اس تاریخ نے ہمارے لئے سامانِ تسلی فراہم کیا ہے، چنانچہ فتوح الشامؒ وہ تنہا تاریخ ہے جس میں مسلمان نازک گھڑیوں میں پناہ لیتے تھے، اور اس سے ایمان و حوصلہ، اور مصائب و حوادث کے لئے مقاومت کی طاقت حاصل کرتے تھے۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ اب تک یاد ہے جب ہمارے خاندان کی خواتین اکٹھا ہوتی تھیں، اور ان میں سے ایک اردو میں فتوح الشامؒ کا منظوم ترجمہ سناتیں، یہ عظیم اسلامی رزمیہ جس کو فتوح الشام سے نقل کرکے ہمارے خاندان کے ایک بزرگ

(سید عبدالرزاق کلامی) نے اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ ۲۲ ہزار[1] اشعار پر مشتمل تھا
ہم ان مجلسوں میں کسی ضرورت سے داخل ہوتے اور آپ کو معلوم ہے،
بچوں کی ضرورتیں کتنی اور کیسی کیسی ہوتی ہیں۔ اور اپنی ماؤں اور بہنوں کے
پاس جاتے تو دیکھتے کہ آنکھیں اشکبار اور آنسو رواں ہیں، اور ان صالح،
پاک نفس و پاکباز خواتین کے سروں پر ایمان و سکینت کا بادل منڈلا رہا ہے
وہ ان جگہوں کے واقعات و حالات سنتی ہیں جن میں صحابہ اور تابعین
شریک ہوتے تھے، کثرت سے شہید اور زخمی ہوتے تھے، سر کٹ کٹ کر گرتے
اور خون کی ندی بہہ جاتی تھی، اور مسلمانوں کے قریب ترین و محبوب ترین عزیز
و اقارب ان سے جدا ہو جاتے تھے، تو وہ ان عام اسلامی واقعات کے
سامنے اپنی مصیبتیں بھول جاتی تھیں، اور ان کے دلوں میں مذہبی جوش،
دیدارِ الٰہی کا شوق، اور مصائب کو جھیلنے کے جذبات موجزن ہو جاتے تھے
اسی طرح مرد یہ رزمیہ پڑھتے اور بہت ذوق و شوق سے سنتے تھے، اور
ان کی رگوں میں شجاعت، ایمان، اور شوقِ شہادت کی بجلی دوڑ جاتی تھی
اس وقت کے اکثر شریف مسلم گھرانوں اور خاندانوں میں اس کا رواج تھا۔

میں کہہ رہا تھا کہ ان تجربوں کی روشنی میں اور اس قابلِ فخر اور روشن و
تابناک تاریخ میں توقع اور امید تو یہ تھی کہ اس ملک میں ——— جہاں سے محمد مصطفیٰ
علیہ وآلہ وسلم کے دین کے مبلغین کاروان در کاروان نکلے تھے ——— پہلے

---

[1] اس منظوم ترجمہ کا نام صمصام الاسلام ہے، اور وہ انھیں کی زندگی میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے
چھپ کر مقبول ہو چکی تھی۔

عرب بھائی اٹھ کھڑے ہوتے اور اس عالمگیر پیغام کو ان گوشوں تک پہونچاتے جو اسلام سے بے بہرہ ہیں، اور اسلامی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کرتے، لیکن رنج و افسوس کا مقام ہے، اور زیادہ ستم ظریفی ہے کہ آج آپ سے یہ درخواست کی جا رہی ہے کہ آپ اس سرزمین کا تحفظ کریں گے، جو اسلام کی پونجی اور راس المال ہے، سارا عالم اسلامی اسی اسلامی مرکز کی توسیع اور اس اصل کا سایہ ہے، آپ متن ہیں، ہم اور سارے مسلمان اس کا حاشیہ ہیں، ہم آپ سے طاقت، اعتماد، فخر اور عزت حاصل کرتے ہیں، ہر وہ کمزوری جو یہاں ہوتی ہے، عالم اسلامی کے شہروں اور دارالحکومتوں میں مجسم اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اگر آپ کسی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتے ہیں تو دہلی، کراچی، جاکرتا اور دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے سر جھک جاتے ہیں۔

حضرات! آپ سب کو معلوم ہے کہ اسلامی فتوحات سے پہلے یہ علاقہ بازنطینی سلطنت کی قلمرو میں تھا، عیسائیت اس علاقہ کا سرکاری اور عام مذہب تھی، یہ بازنطینی سلطنت کا محبوب ترین اور زرخیز ترین علاقہ تھا، اس میں ان کے مقدس مقامات، حضرت مسیحؑ کی جائے پیدائش اور یروشلم تھا، بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا تقاضا ہوا کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو اور یہ علاقہ مسلمانوں کی سرپرستی اور نگرانی میں داخل ہو، چنانچہ عربوں نے اس کو فتح کیا اور اس میں اسلام کو پھیلایا، اور ان کی زبان و تہذیب کو فروغ دیا، اور وہ ایک اسلامی اور عربی ملک ہو گیا، قدرتی بات تھی کہ عیسائی یورپ اس سے دلچسپی لے، چنانچہ میرا خیال ہے کہ یورپ کی بڑی طاقتوں کا اس علاقہ سے دلچسپی لینا کوئی عارضی

اور ان کی تاریخ اور ذہن کی کوئی نئی تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ اس علاقہ کی جانب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں، کسی لمحہ بھی ان کا ذہن اس سے خالی نہیں رہا ہے، متعدد بار اس علاقہ کی بازیابی اور اس پر تسلط حاصل کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں، صلیبی جنگیں جن سے آپ سب لوگ واقف ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اس مقصد کے حصول کے لئے یورپ اپنے تمام وسائل و ذرائع استعمال کرتا رہا ہے، لیکن اس کی تمام کوششیں رائیگاں اور بے سود ثابت ہوئیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو اس ملک پر حکمرانی کرنے اور اس کا تحفظ کرنے کے لئے منتخب فرمایا تھا، وہ طاقتور، امانت دار اور وفادار تھے، اور ہر سودے بازی، دست برداری، سپر اندازی اور ہر قسم کی بے وفائی اور غداری سے دور اور بالاتر تھے، مثال کے طور پر میں صلاح الدین ایوبی کا ذکر کرتا ہوں جس نے صلیبیوں کو شکست فاش دی اور مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام عطا کیا، اس ملک کے مسلمان حکمران اور لیڈر ـــ۔ اپنی کمزوریوں اور رجحانات کے اختلاف کے باوجود ـــ اس ملک کے تقدس اور وقار کے پاسبان، وفادار اور امین تھے، اور میں تو کہتا ہوں کہ عثمانی ترک حکمران بھی ان اسلامی مقدس مقامات کے سلسلہ میں بہت غیور تھے، چنانچہ پوری پانچ صدیوں تک انھوں نے اس ملک کی حفاظت کی، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے، نہ نسب کا، نہ قومیت و وطنیت کا، اور نہ زبان و تہذیب کا لیکن حق کی شہادت، تاریخ کے ساتھ انصاف اور اعتراف حقیقت کا جذبہ یہ کہنے پر مجھے مجبور کرتا ہے، چنانچہ دشمنوں کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اس پر تاریخی شواہد موجود ہیں کہ یہودی کانفرنس کا صدر ڈاکٹر ہرٹزل نے

جیسے بہت سے لوگ صیہونیت کا پیغمبر کہتے ہیں، سلطان عبدالحمید خان سے ملاقات کی اور درخواست کی کہ وہ عثمانی سلطنت کے زیر سایہ یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن قائم کرنے کی اجازت دے دیں۔ اس کے عوض اس نے عثمانی حکومت کے قرضوں کی ادائیگی (یہ قرضے بہت تھے) اور حکومت کے لئے ایک بحری بیڑہ — جس کے اخراجات یہود برداشت کریں گے — تیار کرنے کا وعدہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ عثمانی حکومت کے استحکام اور ترقی کے لئے مالی تعاون کی پیشکش کی، اس کے علاوہ وہ ذات ہمایونی یعنی سلطان عبدالحمید خان کی خدمت میں جو قیمتی تحائف پیش کریں گے وہ مزید برآں۔ سلطان عبدالحمید خان رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب باتوں کے جواب میں کہا: یہ دولت اپنے ہی پاس رکھو تمہارے کام آئے گی۔ میرے نزدیک تو دنیا کے سارے یہودیوں کی دولت بیت المقدس کی مٹی کی ٹھیکری کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ یہودیوں نے سلطان عبدالحمید خان کا تختہ الٹ دیا۔ وہاں پر جیل میں طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ عثمانی سلطنت اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ایسی طاقت کا عظیم اور محکم قلعہ تھی جس سے اغیار خوف کھاتے تھے۔ وہ اس لکڑی کی مانند تھی جسے کسان اپنے کھیت میں کھڑا کرتا ہے اور اس پر ایک کپڑا ڈال دیتا ہے تو پرندے سمجھتے ہیں کہ کوئی آدمی کھڑا ہے، یا کوئی ڈراؤنی شکل موجود ہے اور کھیت سے قریب نہیں ہوتے۔ مگر جب یہ لکڑی گر جاتی ہے، یا کوئی سیانا کوا سمجھ جاتا ہے کہ یہ لکڑی ہے

---

[1] یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سلطان عبدالحمید خان کی معزولی یہودیوں کے اشارے اور سازش سے عمل میں آئی، ان کے پاس معزولی کا فرمان لے کر جو گیا وہ بھی ایک یہودی تھا۔

یا اسے زمین پر پڑی ہوئی دیکھتا ہے، تو چڑیاں اس کھیت پر پل پڑتی ہیں اور فصل کو تباہ کر دیتی ہیں، یہی اس ملک کا قصہ ہے جس پر عثمانی سلطنت حکومت کرتی تھی، دشمن اس سے ڈرتے تھے، اور قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب یہ تحفظ ختم ہو گیا، اور یہ ڈراؤنی لکڑی گر گئی، تو اس پر پل پڑے، اور اس کی تکا بوٹی کر دی۔

عثمانی سلطنت کے زوال اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اس ملک میں جن لیڈروں سے یورپ کو سابقہ پیش آیا، وہ مادہ پرستی اور مغربی تہذیب سے غیر معمولی حد تک متاثر تھے، جدید مغربی نظام تعلیم کے گھن نے ان کو اس طرح کھوکھلا کر دیا تھا جس طرح دیمک لکڑی کو کھوکھلا کر دیتی ہے، یہ لیڈر بے ضمیر، وعدہ شکن، غیرت دینی سے محروم، اور سچی وطن دوستی اور وفاداری سے عاری تھے، یورپ نے یہ دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا، اور اسے یقین ہو گیا کہ ضمیر کی سودے بازی اور اس علاقہ پر تسلط حاصل کرنے کا وقت آگیا ہے، وہ علاقہ جو اسے ہر دور میں محبوب رہا ہے، چنانچہ ہمارے لیڈروں نے ایسی مادہ پرستی اور ضمیر فروشی کا ثبوت دیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یکسر بدل چکا تھا، ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ	اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل
إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ	اور تماشا ہے، اور (ہمیشہ کی زندگی
الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ؛	(کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے،

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ (العنکبوت ۶۴)	کاش یہ لوگ سمجھتے۔
اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا	جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِينَةٌ وَّتَفَاخُرٌ	اور تماشا، اور زینت وآرائش اور
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ	تمہارے آپس میں فخر وستائش اور
وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ	مال واولاد کی ایک دوسرے سے
الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ	زیادہ طلب وخواہش ہے، اس کی
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا	مثال ایسی ہے، جیسے بارش کہ اس سے
وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ	کھیتی اگتی اور کافروں کو کھیتی بھلی لگتی
(الحدید ۔ ۲۰)	ہے، اور پھر وہ خوب زور پر آتی ہے
	پھر اسے دیکھنے والے تو اس کو دیکھتا
	ہے کہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے، پھر
	چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں
	کافروں کے لئے عذاب شدید ہے۔

اور ارشاد نبویؐ ہے۔

اللّٰهم لا عيش الا عيش	اے اللہ آخرت کی زندگی کے سوا
الآخرة۔	کوئی زندگی نہیں۔

خدا پر سے لوگوں کا یقین اٹھ گیا۔ اور دنیا کی عزت، اور جاہ ومنصب کے حصول کے لئے اس طرح تگ ودو کرنے لگے، جیسے یہی چیزیں زندگی کا حقیقی نصب العین ہوں، اقتدار کی راہ میں اصول واقدار، عزت وناموس،

اخلاق و روایات ہر چیز کو بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار ہو گئے۔

دوستو! اولین معرکہ میدانِ جنگ سے پہلے انسان کے دل و ضمیر میں برپا ہوتا ہے، اور جب انسان دل و ضمیر کے داخلی معرکہ میں فتح یاب ہو جاتا ہے تو خارجی معرکوں میں اس کی کامیابی اور فتح یقینی اور لازمی شے بن جاتی ہے، ضمیر کا معرکہ جنگی معرکوں سے پیشتر اور بیشتر دوسرے لفظوں میں مقدم اور زیادہ اہم ہوتا ہے ــــ ہم ضمیر کے معرکہ میں شکست کھا چکے ہیں، ہمارے دل و ضمیر ڈالر کا سامان خرید و فروخت بن چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دشمن کے ناپاک اور توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، اور پیش قدمی کے لئے راہ ہموار ہو گئی، جب دشمن کا تسلط ان لوگوں پر ہو جاتا ہے تو جس طرح چاہتا ہے خرید کرتا ہے۔ اپنے تمام عزائم اور منصوبوں کو تکمیل کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے، اور ملک ان کے سامنے بے بس اور مجبور ہوتا ہے، وہ تڑپتا ہے مگر دشمن کا ہاتھ پکڑ نہیں سکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ قوم کے ساتھ بے وفائی اور وطن کے ساتھ غداری سے روکنے والی چیزیں دو ہی ہو سکتی ہیں، پہلی چیز وہ تو عقیدہ ہے، اور یقیناً عقیدہ ہی سب سے قابل اعتماد اور مضبوط ترین شے ہے، دوسری چیز بھی حب الوطنی ہے، جس نے مغربی اور بعض مشرقی قوموں کے لیڈروں کو اس شرمناک جرم کے ارتکاب سے محفوظ رکھا، لیکن ہمارے سربراہوں اور لیڈروں کے لئے کون سا مانع ہو سکتا ہے جن کے پاس نہ عقیدہ ہے، اور نہ ہی حب الوطنی، یہی وجہ ہے کہ اکثر ہم سنتے ہیں کہ فلاں قوم اور پارٹی لیڈر نے عرب اسلامی وطن کے بعض اہم اور جنگی علاقے دشمن کو

فروخت کر دیئے، یا فلاں لیڈر دشمن کا آلۂ کار اور ایجنٹ ہے، وہ بسا اوقات ایسا نظر آتا ہے کہ اس کو خود دشمن سے زیادہ اس کے مفادات سے دلچسپی ہے گویا ملک و سلطنت کی ہار جیت کا معاملہ ہے۔

حضرات! آپ اسلام کے نازک ترین محاذ اور مسلمانوں کے آخری قلعہ میں رہتے ہیں، سیلاب شہر کی فصیلوں تک پہونچ چکا ہے، اگر سیلاب فصیلوں کو پار کر گیا، تو کوئی بند نہ کوئی روک نہیں سکے گا، آپ آخری دفاعی لائن پر تعینات ہیں، اگر یہ لائن دشمن نے پار کر لی تو سارا عالم اسلامی اس کے پیروں تلے ہوگا، سارے مسلمانوں کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں، آپ ہی ان کی سربلندی و سرخروئی کا سرچشمہ اور ان کی امانت و عزت کے پہرہ دار ہیں، یہ نہیں کہ آپ اپنے اور اپنے ملک کی عزت و سربلندی کے باعث ہیں تو آپ سے پوچھا جائے گا، آپ خدا سے ڈریئے مسلمانوں کی عزت و ناموس اور اسلام کی سربلندی و سرخروئی کے بارے میں، خدا سے ڈریئے ان مسلم قوموں کے بارے میں جو آپ کو اولین مسلمانوں اور اسلام کے اولین علمبرداروں کا نمونہ سمجھتی ہیں، خدا سے ڈریئے ان معصوم روحوں کے بارے میں جنہوں نے ابھی عالم اجسام میں قدم نہیں رکھا ہے جو اس زمانے کا شکر ادا کریں گی، اور آپ کی ممنون ہوں گی کہ آپ نے ان کی مقدس اور قابل احترام چیزوں کی حفاظت کی اور انہیں ایک تابناک ماضی عطا کیا جو ان کے لئے باعث افتخار ہو جس پر وہ ناز کر سکیں، ورنہ بارگاہ خداوندی میں فریاد کریں گی کہ آپ نے ہمارے مقامات مقدسہ کو کھو دیا، ان کے ماضی کو داغدار کر دیا، اور ان کے لئے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔

اس اجتماع اور اس مبارک موقع نے میرے دل میں مضمونوں کا ایک طوفان

ہرا کر دیا ہے، میرے زخموں کو تازہ کر دیا ہے، کیونکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسئلہ کو ایک مسئلہ سمجھتا ہوں، میں پورے عالم اسلام کو ایک ملک سمجھتا ہوں، میرے نزدیک مسلمانوں کو پیش آنے والا ہر حادثہ، اور عالم اسلامی کی ایک ایک انچ زمین پر بھی دشمن کا قبضہ دردناک المیہ ہے، مجھے ہر جگہ مسئلہ فلسطین نظر آتا ہے، اور جہاں بھی جاتا ہوں، با چشم نم کھڑا عربی شاعر متمم بن نویرہ کے اشعار پڑھنے لگتا ہوں ؎

لقد لامنی عند القبور علی البکا   رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رایتہ   لقبر ثوی بین اللوی والدکادک
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا   فدعنی فھذی کلھا قبر مالک

ترجمہ:- قبروں کے پاس سیل اشک بہانے پر میرے رفیق سفر نے مجھے ملامت کی۔
اور اس نے کہا کیا تم صرف اس قبر کی وجہ سے جو لوی اور دکادک کے
درمیان واقع ہے ہر قبر کو بھی دیکھتے ہی آنسو بہانے لگتے ہو۔
تو میں نے کہا ایک غم دوسرے غم کو تازہ کر دیتا ہے میرے لئے یہ تمام
قبریں مالک ہی کی ہیں۔

میری تقریر کے بعد استاد یوسف اعظم کھڑے ہوئے، اور وفد کا استقبال کرتے ہوئے ایک مؤثر تقریر کی، اور مسلمانوں کو خصوصاً اس ملک کے مسلمانوں کو جن کو بڑی آزمائش، صبر آزما اور بہت مشکل حالات کا سامنا ہے، اور جس ذہنی و نفسیاتی کشمکش سے وہ دوچار ہیں اس پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی۔

---

[1] مالک شاعر کا بھائی تھا جو جنگ ارتداد میں مقتول ہوا تھا، متمم ساری عمر اس کو روتا رہا۔

موتمر اسلامی کے مرکز میں

شام کو ۶ بجے موتمر اسلامی کے دفتر گئے جس کے صدر استاذ کامل الشریف ہیں، وہاں موتمر کے ممبران اور متعلقین سے تعارف ہوا۔

وزیر اوقاف کی جانب سے عشائیہ

وزیر اوقاف نے مہمان وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا، جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور فضلا بڑی تعداد میں شریک تھے، انھیں میں ہمارے پرانے دوست بزرگ برگزیدہ عالم شیخ مصطفےٰ احمد زرقا بھی تھے جو آج کل عمان میں کلیۃ الشریعۃ میں استاذ ہیں اور اسلامی شہری قانون ترتیب دے رہے ہیں، امید ہے کہ یہ قانون ملک میں نافذ کیا جائے گا۔

ملاقاتیں

جمعرات کے روز ۱۰ر اگست ۱۹۶۷ء کو متعدد علماء اور تعلیم یافتہ حضرات نے اپنی ملاقات سے نوازا، مثلاً رابطۃ العلوم الاسلامیہ کے صدر استاذ تیسیر ظبیان، سعودیہ میں اردن کے سفیر شیخ محمد امین الشنقیطی اور کردی مجاہد شیخ امین بروسک، شیخ امین بروسک سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی، ہم کو ان کا ایک شعر بھی یاد تھا جو انھوں نے اس وقت کے ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق کے پاس تار میں لکھا تھا جنھوں نے ایران میں اپنے جرأت مندانہ اقدامات کے ذریعے خصوصاً پٹرول کو قومیا کر ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

لقفت عصاک عصیّهم فتمایعوا
لا سحر بعد الیوم انت مصدّق

ترجمہ:- تمہاری لاٹھی ان کی لاٹھیوں کو نگل گئی، اور وہ پیچ پڑے، اب کوئی جادو چل نہیں سکتا، بلاشبہ تم اسم بامسمیٰ مصدق ہو۔[۱]

وفد جب تک عمان میں مقیم رہا، شیخ امین برو سک برابر ملاقات کے لئے آتے رہتے اور ان کے اشعار جہاد کے واقعات اور ان کی دلچسپ گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا رہتا۔

سلط میں تقریر

آج سلط میں راقم سطور کی تقریر کا پروگرام تھا چنانچہ عصر کے وقت ۴ بجے ہم سلط روانہ ہو گئے، پہاڑوں اور وادیوں کے مناظر، پیچ و خم کھاتے ہوئے راستوں کو دیکھ کر ان عرب فاتحین کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا اندازہ ہو رہا تھا، جنھوں نے ان تمام مشکلات کے باوجود اس ملک کو فتح کیا، اور اسلام سے روشناس کیا۔ مجھے خیال ہوا کہ آج کی گفتگو ان اولین عرب مسلمانوں پر ہونی چاہیے جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت عطا کی جس نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی، ان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کیا، اور ساری دنیا سے الگ تھلگ جن محدود ماحول اور جس تنگ و تاریک قفس میں وہ زندگی گزار رہے تھے، اس سے نکال کر اسلام نے ان کو کھلی فضا اور وسیع تر زندگی سے آشنا کیا، میں نے جاہلیت اور اسلام کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے عربوں اور سارے عالم کی نشاۃ ثانیہ

---

[۱] یعنی تم واجب التصدیق ہو۔

کے سلسلہ میں اسلام کے ناقابل فراموش احسان عظیم پر تفصیل سے روشنی ڈالی، تقریر بیحد جامع تھا جلسہ گاہ حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، تقریر کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

استاذ کامل الشریف کے دولت کدہ پر

سفیر محترم سید کامل الشریف نے وفد کے اعزاز میں اپنے دولت کدہ پر عشائیہ دیا

عمان سے اربد

۱۰ اگست ۱۹۷۳ء جمعہ کا روز اربد کے دورہ کے لئے مقرر تھا، اربد عمان کے بعد اردن کا وہ مرکزی شہر سمجھا جاتا ہے جس پر اسلامی چھاپ ہے، اور اپنی دینی غیرت اور اسلامی جذبات کے لئے مشہور ہے، یہ شہر اردن کی شمالی سرحدوں پر واقع ہے، اربد کا سفر بہت تاریخی اور دلچسپ رہا، مختلف تاریخی آثار و مقامات اور یہاں کی قدیم تہذیب کے نشانات دیکھنے کا موقع ملا، عمان سے چلے تو بقعہ نامی ایک میدان سے گزر ہوا، جہاں فلسطینی پناہ گزینوں کا ایک کیمپ نظر آیا، جو چند ٹوٹے پھوٹے گھروں پر مشتمل تھا، کچھ گھر اینٹ کی پتلی دیواروں سے بنائے گئے تھے، اور کچھ سیمنٹ کی پلیٹوں سے، بستی میں بازار اور دوکانیں بھی تھیں، افلاس اور بدحالی کا تاریک سایہ ہر طرف اپنے پر پھیلائے ہوئے تھا، بستی کے قریب بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مشن اسکول تھا۔

بقعہ کے بعد جرش میں ٹھہرے، جرش کا شمار قدیم رومی کھنڈرات میں ہوتا ہے جو زبان حال سے رومیوں کی ترقی یافتہ تہذیب اور تمدنی عروج و صناعی کی شہادت

دے رہے ہیں، یہ باقی ماندہ آثار ان کے وحشی اور مردانہ کھیلوں سے غیر معمولی دلچسپی کا بھی پتہ دیتے ہیں، جو (یورپ کی تاریخ تہذیب و اخلاق کے بیان کے مطابق) سنگدلی، بربریت اور ایذا رسانی سے لطف اندوز ہونے کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت کے ایک اسٹیڈیم کے واضح نشانات بھی پختہ نشست گاہوں اور بلند ستونوں کی شکل میں موجود ہیں، شہر سے اسٹیڈیم تک پختہ سڑکیں ہیں، جو ڈسپلن اور فن تعمیر کے عمدہ ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

جرش کے بعد ایک دوسرا علاقہ آیا، اس میں "سوف" نامی فلسطینی پناہ گزینوں کا ایک کیمپ ہے، اربد پہنچنے سے پہلے ایک اور کیمپ سے بھی گزر ہوا جو "مخیات الحصن" کے نام سے مشہور ہے۔

شمالی سرحدوں پر ——— تاثرات

اربد کو ایک طرف چھوڑ کر ہم نے شمالی سرحدوں کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔ آخر کار پہاڑی علاقہ میں پہنچے اور ام القیس نامی بستی میں ٹھہرے، گولان کی پہاڑیاں ——— جن کا نام محل وقوع کی جنگی اہمیت کی بنا پر جنگ کے دنوں میں ساری دنیا میں گونج رہا تھا ——— ہمارے سامنے کھڑی تھیں، ہمارے اور ان کے درمیان ایک گہری وادی تھی جس میں دریائے یرموک سانپ کی طرح مڑتا، لچکتا اور بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ حافظے کے پردے پر یرموک کا واقعہ ابھر آیا، اور پھر یادیں تازہ ہو گئیں اور زخم ہرے ہو گئے اور اندلسی شاعر صالح بن شریف الرندی کے یہ اشعار ہماری زبان پر تھے۔

حتی المحاریب تبکی وهی جامدة   حتی المنابر ترثی وهی عیدان

محراب بھی آہ و بکا کر رہی ہیں، حالانکہ وہ جامد ہیں، منبر بھی مرثیہ خواں ہیں، حالانکہ وہ بے جان لکڑیوں کے سوا کچھ نہیں۔

اس طرح کا منظر دیکھ کر دل پگھلنے لگتا ہے بشرطیکہ دل میں ایمان و یقین کی چنگاری موجود ہو۔

لمثل هذا يذوب القلب من كمد
إن كان في القلب إسلام وإيمان

اس وادی میں دو آباد بستیاں موجود ہیں، ایک دریا کے جنوب میں دوسری شمال میں، دریا کے شمالی جانب اور گولان کی پہاڑیوں سے دور تک کا علاقہ شام کے قبضہ میں تھا اور جنوبی حصہ پر اردن کی حکمرانی تھی، جو اب بھی باقی ہے، مگر سنہ ۶۷ء کی جنگ میں شمالی علاقہ شام کے ہاتھ سے جاتا رہا، اور گولان پر اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔

گولان کی پہاڑیوں کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حقیقت کا جتنا صحیح علم اور صورت حال کا جتنا صحیح اندازہ ہوا وہ یہاں کتابیں پڑھنے کے بعد بھی نہیں ہو سکتا تھا ان قدرتی انتظامات و تحفظات کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو دشمن سے بالکل محفوظ کر دیا ہے، یہ پہاڑیاں صرف پہاڑیاں نہیں ہیں بلکہ نہایت مضبوط قلعے ہیں، جن کو فتح کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، اس ملک کی جانب جس پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات ہیں کوئی دشمن اسی وقت آنکھ اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے جب اس کے باشندے اس عظیم احسان کو فراموش کر جائیں، جو ان قدرتی فصیلوں اور قلعوں کی شکل میں نظر آتا ہے، اس زرخیز سرزمین کی ناقدری کرنے لگیں جو ان کے لیے دودھ اور شہد کی نہریں بہا رہی ہے اور جس نے اسلامی دعوت ،

اسلامی فتوحات اور اسلامی تہذیب کے میدانوں میں نمایاں تعمیری کردار ادا کیا ہے، اور وہ اپنی عزت و ناموس کے تحفظ سے بالکل غافل اور بے پروا ہو جائیں۔ گولان کی پہاڑیاں ایسا قلعہ ہیں جو دیا تو جا سکتا ہے، گرایا نہیں جا سکتا، ملک کے ساتھ غداری کر کے کسی کے حوالہ ..... تو کیا جا سکتا ہے، مگر زبردستی اس کو چھینا نہیں جا سکتا۔ آج یہ قلعہ اسرائیل کے قبضہ میں ہے، اور اس کی توپیں کسی وقت بھی ایک طرف اردن اور دوسری طرف دمشق پر آسانی سے گولہ باری کر سکتی ہیں۔

گولان کے شمال میں بحیرۂ طبریہ ہے جس کے ساحل پر طبریہ نامی اسرائیلی شہر آباد ہے، یہ شہر ام القیس کے ٹیلوں پر کھڑے ہونے سے صاف نظر آتا ہے، اور اردنی علاقہ میں واقع نہر یرموک کے ساحل سے وہ شامی علاقہ بھی دیکھا جا سکتا ہے جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے اور جو وہاں سے چند کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، شام کی مشہور بستی حمۃ[1] اسی علاقہ میں ہے جس کے مکانات سنسان اور مسجدیں ویران ہو چکی ہیں، اسرائیلی حکومت نے اس علاقہ میں ضرورت کے مطابق کئی سڑکیں بنا دی ہیں۔

اس دورے سے ہم سب نہایت افسردہ، غمگین اور شکستہ خاطر واپس آئے۔ شہر کی ایک مرکزی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی، خطیب نے موثر اور فصیح و بلیغ خطبہ دیا، پھر شہر کے ایک سربرآوردہ شخص کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا، کچھ دیر آرام کیا اور نماز عصر ادا کرنے کے بعد کلچرل ہال کا رخ کیا، ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، تعلیم یافتہ خواتین بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں، حاضرین نے پرجوش اسلامی نعروں سے ہمارا استقبال کیا، جس سے شہر کے اسلامی مزاج کا پتہ چل رہا تھا۔

---

[1] یہ شام کا مشہور شہر "حماۃ" نہیں ہے جس کو عام طور پر "حما" بولا جاتا ہے۔

اریڈ میں تقریر: اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہائے نظر

تقریر کا موضوع تھا: "اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہائے نظر" تقریر میں اسلام کے مقام، کردار اور اس کے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف حلقوں میں جو مختلف زاویہ نظر پائے جاتے ہیں ان کا جائزہ لیا گیا تھا، مثلاً بعض لوگوں کے نزدیک اس سائنٹفک اور ایٹمی دور میں اسلام اور اسلامی نظام کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان میں سب سے ممتاز اور اسلام پسند نقطۂ نظر ان حضرات کا ہے جن کا خیال ہے کہ اسلام ایک محدود دنیا اور پسماندہ دور میں آیا تھا اور اپنا اصلاحی رول ادا کر چکا۔ اس نے بہت سی اجتماعی خرابیوں کو دور کیا، خرافات و اوہام کو ختم کر کے بعض قابل قدر اصلاحات کیں۔ اس دور میں اسلام یقیناً فائدہ سے خالی نہیں تھا جب نہ سائنس کا وجود تھا، نہ تہذیب و تمدن نے اتنی ترقی کی تھی اور نہ جدید اختراعات سامنے آئی تھیں۔ ایک طبقہ اپنی رواداری اور اسلام دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یقیناً اسلام نے انسانیت کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا ہے، انسانیت پر اسلام کا بہت احسان ہے، لیکن آج وہ ایک خالی خولی بندوق کی طرح ہے، جو اپنا کام کر چکی ہو، اس ایٹمی دور میں جبکہ تمدن، ٹکنالوجی، سائنس، تہذیب اور فلسفہ اپنے نقطۂ عروج پر ہیں، اسلام کا تجربہ کرنا وقت اور طاقت کے ضیاع کے مترادف ہوگا۔ میں نے اس زاویہ نگاہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: یہ زاویہ نگاہ بالکل غلط اور غیر منصفانہ ہے، جو اسلام کو سمجھتا ہے نہ اس زمانے کے مزاج اور اس کے ان پیچیدہ مسائل کا شعور رکھتا ہے، جن کا دور حاضر کے مفکرین اور لیڈروں کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ انسانیت کا بیڑا پار کرنے، اس دور کے مسائل کو حل کرنے اور حالات کو صحیح رخ دینے کے سلسلہ میں

اسلام کیا کردار ادا کرسکتا ہے اس سے یہ طبقہ بالکل ناآشنا ہے۔

میں نے کہا: یہ عجیب بات ہے کہ وہی غیر اسلامی فلسفے اور نظام ہائے حیات جو یورپی قوموں کو یقین ہے، اور انھوں نے ان کا تجربہ کیا اور کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی جب عربوں نے ان فلسفوں اور نظاموں کا تجربہ کیا تو تاریخ شاہد ہے کہ انھیں اس تجربہ میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، جب انھوں نے قومیت، اشتراکیت یا کیمونزم کو اختیار کیا تو حالات سدھرنے کی بجائے اور خراب ہوگئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کا مستقبل اسلام کے مستقبل سے وابستہ کردیا ہے، اور ان دونوں کے درمیان ایک لازوال اور ناقابل شکست رشتہ قائم کررکھا ہے گویا عرب ایک ایسی امت ہیں جس کے پاس ایک مخصوص پیغام اور متعین نصب العین ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اسلام کی امانت اور اس کے تحفظ کے لیے منتخب فرمایا ہے، ان کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے نظام زندگی کو اختیار کریں، ان کی مثال اس محبوب اور لاڈلے طالب علم کی ہے جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر استاذ کا مرکز توجہ بن گیا ہو، اور اسی وجہ سے اگر وہ اسکول سے غیر حاضری کرتا ہے تو استاذ کسی قسم کی نرمی نہیں برتتا، اس کو بے مہار اور آزاد نہیں چھوڑتا ہے، غبی، کند ذہن اور آوارہ لڑکوں کی استاذ کوئی پروا نہیں کرتا مگر یہ ذہین اور منظور نظر طالب علم اگر غلطی کرتا ہے تو استاذ اس کو سزا دیتا ہے، اگر غیر حاضر ہوتا ہے، تو باز پرس کرتا ہے، اگر غفلت اور سہل انگاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کو تنبیہ بلکہ بعض اوقات زجر و توبیخ کرتا ہے۔

حالیہ واقعات نے اور اسلامی ممالک جس خوف و ہراس اور جس بے چینی اور بحران سے دوچار ہیں اس نے ثابت کردیا ہے کہ عربوں کو اسلام کے سایہ ہی میں پناہ

لیکن یہ ان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ خلوص دل سے اسلام کو اپنائیں، نفاق اور دو رخی کی راہ ترک کر دیں، راحت طلبی، تعیش پسندی، عیش کوشی اور بے حیائی سے بھرپور رنگین اور غیر سنجیدہ زندگی کو خیر باد کہہ دیں، لذتیت اور مفاد پرستی کے فلسفہ کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں، اگر عرب شریفانہ اور باعزت زندگی گزارنا اور نصرت الٰہی کے حقدار بننا چاہتے ہیں تو ان کو اس طرح رہنا چاہیے جس طرح کوئی قوم ہنگامی حالات (ایمرجنسی) میں یا سرحدوں اور محاذوں پر زندگی گزارتی ہے، انھیں معتدل، سادہ اور متقشفانہ اور مجاہدانہ زندگی گزارنی چاہیے۔

تقریر نے حاضرین سے تائید و تحسین حاصل کی اور ریکارڈ کی گئی، اور جب ہم اربد سے روانہ ہو رہے تھے تو گھروں اور بازاروں سے ریکارڈ شدہ تقریر سنائی دے رہی تھی۔

مجاہد اسلامی عبداللہ التل کا انتقال اور ان کے کنبہ کی تعزیت

عمان میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک مشہور اسلامی رہنما اور مجاہد جنرل عبداللہ التل کے انتقال کی افسوسناک خبر سنی، میری ان سے ملاقات ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں استاذ محمد علی الطاہر کی قیامگاہ پر ہوئی تھی، فلسطین کے محاذ پر ان کی سرفروشی اور جہاد کے کارنامے اور مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں ان کی استقامت اور ثابت قدمی کی خبریں سننے میں آتی تھیں، وہ مجاہد اور قائد ہونے کے ساتھ ساتھ موصوف ایک اچھے مصنف[1] بھی تھے، ان کی وفات کی خبر سے صدمہ ہوا

---

[1] ان کی ایک ضخیم اور پر از معلومات کتاب "خطر الیہودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ" دار القلم کویت نے چند سال پہلے شائع کی، مسئلہ فلسطین کے متعلق ان کی ڈائری بھی ۱۹۵۹ء میں چھپ چکی ہے۔

ہمارے نزدیک ہم پر اور ہر مسلمان پر جو مرحوم کے مجاہدانہ کارناموں اور اسلام اور ملک کے لئے ان کی قربانیوں کی قدر کرتا ہے مرحوم کا یہ حق ہے کہ ہم ان کے خاندان کی تعزیت کریں اور ان کے دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ کچھ وقت گزاریں چنانچہ ہم مرحوم کے گھر گئے ان کی تعزیت کی اور مرحوم کے کارناموں کا تذکرہ اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

لہو و لعب اور تفریحات کا مرکز

تعزیت کا فرض انجام دینے کے بعد عمان واپس آئے، ہر مرتبہ آمد و رفت میں مدینۃ الملاہی سے ہمارا گزر ہوتا تھا، جو دارالحکومت کے مضافات میں واقع ہے، ایسے سنگین حالات میں جبکہ قوم موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہے، اور ہر وقت جنگ کا خطرہ درپیش ہے، مدینۃ الملاہی کے وجود پر ہم کو سخت تعجب ہوا، اور معلوم ہوا کہ اس شہر میں سات حوض (SWIMING POOLS) ہیں جن میں آزادانہ اختلاط کے مواقع ملتے ہیں، ان میں سے ایک حوض فندق عمان، جس میں ہمارا قیام تھا، کے پاس کا تھا، شہر میں سینما گھر، کلب اور آزادانہ تفریح کے مرکز بڑی تعداد میں موجود ہیں، دوسری طرف ملک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے، جو نہیں معلوم کب پھٹ پڑے اور اس ملک کو تباہی کے اندھے غار میں پہنچا دے، یہ نامناسب صورت حال ملک کے سیاسی جنگی اور مذہبی حالات سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتی۔

معلوم ہوا کہ اس خطرناک صورت حال کو جو اسلام کے سادہ، سنجیدہ اور پروقار مزاج کے قطعاً منافی ہے، غیر ملکی اور خارجی طاقتوں سے غذا ملتی ہے، یہ طاقتیں اس کے بقا اور فروغ کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، اسلامی ملکوں کے حالات کا مطالعہ کرنے اور

ان کی اخلاقی تاریکی اور سیاسی دیوالیہ پن کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس پورے علاقہ کو مرعوب رکھنے والی طاقت امریکہ ہے، امریکہ چاہتا ہے کہ یہ ممالک فکری اور اخلاقی انحراف کا شکار ہو کر اس کی پناہ لیتے اور اس کی زلہ ربائی کرنے پر مجبور رہیں، اور اپنے طاقتور حریف اسرائیل کے مقابلہ میں نہایت کمزور اور اندرونی طور سے بالکل کھوکھلے ہو جائیں، ان حالات کے باقی رہنے اور بد سے بدتر ہونے میں امریکہ کے ساتھ ساتھ ویٹیکان (VATICAN) کے مفادات بھی پوشیدہ ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

اصحاب کہف کے غار میں

۱۸ اگست ۱۹۷۳ء کو سنیچر کے روز اصحاب کہف کا غار دیکھنے گئے جو عمان کی ایک بستی میں واقع ہے ہماری رہنمائی آثار قدیمہ کے مشہور ماہر اردن کے محکمہ آثار عامہ کے فنی معاون استاذ رفیق وفا دجانی کر رہے تھے، انھیں پورا یقین تھا کہ اصحاب کہف نے جن کا قصہ سورہ کہف، عیسائی صحیفوں اور تاریخ و ادب کی کتابوں میں مذکور ہے ——— جس غار میں پناہ لی تھی، وہ یہی غار ہے، میں اپنی کتاب "معرکۂ ایمان و مادیت" ——— یا "سورہ کہف کا مطالعہ" میں اس موضوع پر بحث کر چکا ہوں، اور میں نے اکثر مصنفین کے اس خیال کو راجح قرار دیا تھا کہ یہ قصہ "افسوس" یا "افسیس" نامی شہر میں وقوع پذیر ہوا تھا، شہر ایشیائے کوچک میں ازمیر سے ۶۰ کیلومیٹر دور دریائے قسطرہ کے جنوبی ساحل پر اناطولیہ کے ۱۲ یونانی شہروں میں سے ایک تھا، یہ شہر اس وقت ترکی میں ہے، اور طرسوس کے نام سے مشہور ہے، اور جس غار میں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی، وہ اس شہر کے نواح میں ایک پہاڑ میں تھا، پہاڑ کا نام (ANCHILIS) تھا، لیکن استاذ رفیق اس پر مصر تھے کہ

اصحاب کہف کا غار یعنی کہف الرجیب ہے جس کو دیکھنے .. ہم لوگ گئے تھے اس خیال کے حق میں ان کے پاس بہت سے دلائل اور شواہد ہیں جن کی علمی اور تاریخی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ دلائل انھوں نے اپنی کتاب "اصحاب کہف کے غار کا اکتشاف" (اکتشاف کہف اہل الکہف) میں تفصیل سے بیان کیے ہیں، اور اس کا ایک نسخہ ہم کو ہدیہ بھی کیا، استاذ ہم کو غار کے پاس لے گئے اور بہت سے ایسے آثار اور علامات کی نشاندہی کی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس پر قرآن مجید کا بیان منطبق ہوتا ہے، میں نے وعدہ کیا کہ میں اپنی کتاب پر نظر ثانی کروں گا، اور استاذ کی وسیع معلومات اور علمی تحقیقات سے استفادہ کرنے کی کوشش کروں گا، حق پر کسی کی اجارہ داری نہیں، علم میں ترقی اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کہف الرجیب عمان کے جنوب مشرق میں ۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، استاذ نے بتایا کہ یہی رائے مقدسی، یاقوت، سائح ہروی اور بیرونی وغیرہ کی بھی ہے، واقعتاً علم بلاشبہ استاذ ملک کی بیش بہا علمی سرمایہ ہیں جن کی قدر کرنی چاہیے اور اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کو مفید بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دوپہر کا کھانا زرقا میں شیخ عبدالباقی جمو کے دولت کدہ پر کھایا گیا، موصوف زرقا کے حلقہ سے پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، کھانے پر علما و عمائدین شہر اور اساتذہ کی خاصی تعداد مدعو تھی۔

ایک اہم مجلس مذاکرہ میں شرکت

آج ایک مجلس مذاکرہ میں شرکت کرنی تھی جس کا اس وفد کی آمد کی تقریب میں

خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ اور جو غالباً اس دورہ کا حاصل تھا۔ یہ مجلس ساڑھے پانچ بجے شام کو الکلیۃ العلیۃ الاسلامیۃ کے ہال میں منعقد کی گئی۔ مجلس میں پروفیسر، تعلیم یافتہ طبقہ اور اسلامی ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات معتدبہ تعداد میں موجود تھے۔ استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے بڑی مہارت اور سلیقہ سے مجلس کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ راقم سطور، استاذ احمد محمد جمال اور استاذ کامل الشریف خصوصی مہمان کی حیثیت سے مذاکرہ و مباحثہ میں حصہ لینے والے تھے۔ مجلس کا موضوع تھا: موجودہ معاشرہ میں مسلم نوجوانوں کا کردار۔ ذیل میں ناظم مجلس کے سوالات اور راقم سطور کے جوابات درج کئے جاتے ہیں۔

نوجوانوں کی بے چینی کے اسباب اور اس کا علاج

سب سے پہلے استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے افتتاحی تقریر کی۔ تقریر میں نوجوانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی بے چینی پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ پورے عالم اسلام میں جو طاقتیں اور جو نظریات آج کام کر رہے ہیں ان کا بہت مکمل، مفصل اور بھرپور جائزہ لینے کے بعد استاذ نے پہلا سوال کرتے ہوئے کہا:

”استاذنا! آج پورا عالم اسلام عقیدہ، فکر اور عمل غرض ہر سطح پر ایک تباہ کن اضطراب، الجھن اور بے چینی میں گرفتار ہے۔ یہ بے چینی ہمارے ملک کے مسلم نوجوانوں میں خصوصاً نمایاں طور پر پائی جاتی ہے تو سب سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اسباب کیا ہیں جن سے یہ بے چینی پیدا ہوئی ہے یا جن کی وجہ سے یہ باقی ہے؟

میرا ریکارڈ شدہ جواب (قدرے ترمیم و اضافہ کے بعد) حسب ذیل تھا۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس علمی مذاکرہ میں مجھ پر اعتماد کیا اور مجھ سے اور میرے رفقاء سے اس سوال کا جواب طلب کیا ہے جو حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور جس صورت حال سے ہم گزر رہے ہیں، اس کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

حضرات! میں آپ سے بہت صفائی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھے بہت تعجب ہوتا اگر مسلم نوجوان اس بے چینی کا شکار نہ ہوتا اور اس اضطراب سے دوچار نہ ہوتے جیسا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں، درخت اگر اپنا پھل دیتا ہے تو وہ قابل ملامت نہیں ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ باغبان کوئی پودہ نہ لگائے، لیکن اگر وہ ایک پودہ لگاتا ہے، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، وقت پر اس کو پانی دیتا ہے، اس کی حفاظت اور نگرانی کے لئے مسلسل رات رات بھر جاگتا ہے، اور جلتی دھوپ اور کڑاکے کی سردی کسی چیز کی پروا نہیں کرتا، اس امید میں کہ یہ درخت پروان چڑھے گا، توانا اور تناور ہو کر پھل دے گا ___ تو یہ نہایت غیر معقول اور غیر فطری بات ہوگی کہ جب وہ درخت بتدریج پھل دینے لگے تو باغبان درخت کو ملامت کرے، خفا ہو، اور اس کے پھل کو ناپسند کرے اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے، اس لئے کہ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے اور جب سے وہ درخت وجود میں آیا ہے، اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، زیتون کا درخت زیتون کا پھل اور انار کا درخت انار ہی کا پھل دے گا۔

اس الجھن کا جس سے دنیا کے نوجوان خصوصاً مسلم نوجوان دوچار ہیں سب سے اہم سبب تعلیم و تربیت اور اطلاعات و نشریات کا تضاد ہے ملک کے موروثی خیالات کچھ ہیں، ماحول کے تقاضے کچھ ہیں اور عملاً دنیا کے مطالبے کچھ ہیں، اس الجھن اور تباہ کن الجھن کا بنیادی سبب یہی عجیب غریب تضاد ہے جو نوجوانوں پر مسلط کر دیا گیا ہے، اور اس نے ان کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے ـــ ہوتا یہ ہے کہ بچہ ایک مسلمان خاندان اور مسلمان گھر میں پیدا ہوتا ہے جس کی بنا پر بہت سے اسلامی عقائد سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے، پھر ایک مذہبی اور باشعور ماحول ـــ جو اسلام کے اصولوں پر یقین رکھتا ہے ـ میں پروان چڑھتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسلامی تاریخ پڑھنے کی توفیق دی تو اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر اس کو جدید تعلیم گاہوں کی طرف ہانک دیا جاتا ہے (اس لفظ کے استعمال پر معذرت چاہوں گا اس لئے کہ بچہ ایک کمسن ہوتا ہے اور اس کو کوئی اختیار نہیں ہوتا) جہاں وہ اپنے اساتذہ سے ـــ جن کی وہ تعظیم اور احترام کرتا ہے، اس لئے کہ وہ بہت سے فنون میں ماہر اور صاحب اختصاص ہوتے ہیں ـــ ایسی باتیں سنتا ہے جو ان افکار و خیالات کے بالکل خلاف ہوتی ہیں جو گزشتہ اسلامی تربیت کی وجہ سے اس کے ذہن و دماغ میں بیٹھ گئے تھے، ہر طرف وہ ایسی چیزیں دیکھتا اور سنتا ہے جو گزشتہ تمام چیزوں کی نفی کرتی یا کم سے کم ان کی تحقیر کرتی ہیں اب وہ ایک عجیب تضاد اور شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ذہنی کشمکش

سائے کی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی یہاں تک کہ کوئی معجزہ رونما ہو جائے واقعہ یہ ہے کہ جس ماحول میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس ذہنی کشمکش سے نجات کسی معجزہ سے کم نہیں ہوگی، یہ نازک ترین اور مشکل ترین قسم کی کشمکش ہے متضاد قوتوں کے درمیان کشمکش، میدان جنگ میں بھی کشمکش ہوتی ہے مگر جنگ کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مختصر ہوا کرتی ہے لیکن اس کشمکش سے تو انسان ہر وقت دوچار رہتا ہے، خواہ مسجد ہو خواہ مدرسہ، گھر ہو یا بازار یہاں تک کہ اپنے اور اپنے نفس کے درمیان بھی اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

اس تلخ، خوفناک، ہلاکت آفریں اور گہری کشمکش کا سرچشمہ اطلاعات نشریات اور صحافت (وسیع مفہوم میں) کے ادارے اور ٹیلیویژن ہوتے ہیں ہمارے نوجوان ہر وقت ایسے پروگرام سنتے اور دیکھتے ہیں، جو ان کی قدیم تربیت کے باقی ماندہ اثرات کو بھی ختم کر دیتے ہیں، ان کے دماغوں میں ذہنی بغاوت اور نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتے ہیں۔ پریس یا جرنلزم جو بہت سے لوگوں کی نگاہ میں (HIS MAJESTY) سے کم نہیں ہے ہمارے نوجوانوں کو صبح سویرے نہار منہ اور قبل اس کے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کریں فاسد اور متعفن غذا دیتا ہے اور ان کے سامنے جذبات کو برانگیختہ کرنے والا مواد پیش کرتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے وہ کسی عورت کی برہنہ تصویر، فحش عنوانات یا ایسے مضامین اور تبصرے ہوتے ہیں جو ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں اور ایمان و اعتماد کی بنیادوں کو متزلزل کرتے ہیں، ہمارے نوجوان ان چیزوں کو پورے ذوق و شوق اور

دلچسپی و انہماک سے پڑھتے اور ان سے متأثر ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں ایسی علمی کتابیں آتی ہیں جو مرعوب کن عنوانوں کی حامل ہوتی ہیں، اور جو ایسے مصنفین کا نتیجۂ فکر ہوتی ہیں، جن کی ذہانت، عبقریت اور کمال پر ہمارے نوجوانوں کا ایمان ہوتا ہے، یہ کتابیں مفسد اور مشکک مواد سے پر ہوتی ہیں جو مذہب کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اسلامی تاریخ کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اسلامی شریعت کے مآخذ بیان بلکہ زبان و ادب کے اولین سرچشموں کو مشکوک قرار دیتی ہیں، اس امت کی صلاحیتوں اور اس کے ابدی پیغام کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اور عربی زبان کی صلاحیت کو مشکوک قرار دیتی ہیں، علمی نظریات اور ذہن و دماغ کو ماؤف کرنے اور تہذیب و اخلاق کو بگاڑنے والے افکار و خیالات کا یہ عجیب و غریب معجون مرکب جب ہمارے نوجوانوں کے دماغوں میں اترتا ہے تو سخت بے چینی اور پریشان کن الجھن کو جنم دیتا ہے، یہ معجون مرکب تو ایسا ہے کہ بڑے سے بڑے پختہ ذہن، آزمودہ کار اور بالغ نظر شخص کو الجھن میں مبتلا کر دے، تو ہمارے نرم و نازک نوجوان، یہ نرم و نازک شگوفے جو ابھی کھلے نہیں ہیں کس طرح اس کو ہضم کر جائیں گے، ان سے کیونکر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان سخت تھپیڑوں کے سامنے ٹکے رہیں گے۔

حضرات! یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی گاڑی یا سواری ہو، اور اس کے آگے بھی ایک گھوڑا جتا ہو اور پیچھے بھی اور دونوں اپنی اپنی سمت گاڑی کو کھینچ رہے ہوں، تو جس طرح اس گاڑی کے سوار سخت کشمکش اور الجھن میں

مبتلا ہوں گے، اسی طرح ہمارے نوجوان ایک جھولے میں دائیں بائیں جھول رہے ہیں۔

عرب دارالحکومتوں سے جن کو فکری اور مذہبی قیادت حاصل تھی، کم پچاس سال سے جو ادبی سرمایہ ہمارے سامنے آرہا ہے اس نے نونہالوں، نوجوانوں بلکہ بعض سن رسیدہ لوگوں کے دلوں میں بھی شک و اضطراب کے بیج بوئے، ان کو بعض اوقات اپنے وجود پر بھی شک ہونے لگا، اور وہ تمام چیزیں جو شہرت و تواتر سے آگے بڑھ کر بدیہیات تک پہنچ گئی ہیں مشکوک نظر آنے لگیں، ان کتابوں نے جن کے پیچھے دولت، شہرت، تقلید یا نعروں اور تالیوں کی گونج جیسے سستے مقاصد کارفرما تھے، ہمارے نوجوانوں کے دلوں اور دماغوں میں شک و ارتیاب، الجھن، کشمکش اور تضاد کی تخم ریزی کی جس کے نتیجے میں موجودہ صورت حال پر کوئی حیرت اور تعجب نہیں ہے، اور یہی نوجوانوں کی الجھن اور بے چینی کا بنیادی سبب ہے۔

پھر استاذ نے دوسرا سوال اٹھایا "نوجوانوں کی اس بے چینی کا ـــــ علاج کیا ہے؟" میرا جواب حسب ذیل تھا:

"میرے نزدیک نوجوانوں کو اس مہلک الجھن سے نجات دلانے کے لئے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ نظام تعلیم کی دوئی ختم کر دی جائے، آپ کے سامنے اس نکتہ کی وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت تعلیم دو بلاکوں میں تقسیم ہے، مذہبی بلاک اور غیر مذہبی اور سیکولر بلاک یا قدیم بلاک اور جدید بلاک، نظام تعلیم کی یہی ثنویت یا دوئی نوجوانوں کی موجودہ الجھنوں کا

اہم ترین سبب ہے۔ اس لئے اگر ان الجھنوں کو دور کرنا ہے تو سب سے پہلے مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا خود تعلیمی مواد میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک تعلیم جس چیز کو ثابت کرتی ہے، دوسری اس کی نفی کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان علوم کا بھی جو بظاہر عقائد سے تعلق نہیں رکھتے عقائد سے بہت گہرا تعلق ہے۔ تعلیم مجرد اور معروضی نہیں ہوتی۔ تعلیم کے غیر جانبدار، بے رنگ اور عقائد پر اثر انداز نہ ہونے کا نظریہ بہت پرانا اور کب کا مسترد اور (OUT OF DATE) ہو چکا۔ اب اس نظریہ میں ذرہ برابر بھی صحت اور واقعیت باقی نہیں رہی۔ پس پہلا انقلابی اور بنیادی قدم یہی ہے کہ نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ نہ کوئی قدیم ہے نہ جدید۔ نہ کوئی مذہبی ہے لادینی اور دینی عیسائی کہنوتی مفہوم میں بلکہ صحیح اسلامی مفہوم میں کوئی تعلیم لادینی ہے نہ دنیوی نہ عصری نہ سیکولر۔ تعلیم ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اگر کوئی تقسیم ہو سکتی ہے تو مقاصد اور وسائل کی تقسیم ہو گی۔ ان وسائل کے اندر بھی ایک وحدت ضروری ہے جو ان کو باہم متحد اور بنیادی نصب العین کا پابند بنا سکے۔

پھر اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جس کو شریعت اور قرآن کی زبان میں نفاق کہتے ہیں۔ ہم آہنگی سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ بلکہ ایک ہی ملک کے نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ بلاشبہ اس کے لئے

پورے نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینا ہوگا اور ایسا نظامِ تعلیم وضع کرنا ہوگا جو ایک مکمل، مرتب اور باہم پوری طرح سے ہم آہنگ اکائی ہوگا۔ اس کے لئے ایک زبردست انقلاب لانے کی ضرورت ہے، ایسا انقلاب جو جرأت مندانہ، وسیع و عمیق اور ہمہ گیر انقلاب ہو اور پھر قدرتی طور پر ایسے پختہ فکر اور بالغ نظر افراد کی ضرورت ہوگی جو صرف یورپ کے خوشہ چیں نہ ہوں، نصابِ تعلیم میں اجتہاد سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے قدرتی طور پر زبردست منصوبے تیار کرنے ہوں گے، وسیع اور ہمہ گیر سطح پر جد و جہد کرنی ہوگی، اور اسلامی حکومتوں اور اہم اسلامی اکیڈمیوں کو ان منصوبوں کی سرپرستی کرنی ہوگی۔ اگر ہم نظامِ تعلیم کو بدلنے میں کامیاب ہوگئے اور اگر ہم نے اپنے معاشرے سے یہ تضاد ختم کر دیا تو مجھے پوری امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس ہلاکت آفریں کشمکش اور الجھن سے نجات پا جائیں گے۔"

پھر استاد نے تیسرا سوال اٹھاتے ہوئے کہا:۔

"اب استاذ ابوالحسن اس کی وضاحت کریں گے کہ ان اداروں کے درمیان صحیح ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے حکومت کا کیا مثبت رول ہونا چاہئے؟"

میرا جواب یہ تھا:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ہلاکت آفریں عوامل کو دور کرنے اور معاشرہ کو پر امن اور پر سکون زندگی عطا کرنے کے سلسلہ میں حکومت کا کردار بہت اہم اور فیصلہ کن ہوتا ہے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب حکومت کے پاس کوئی واضح فکر ہو ـــ میں یہاں کسی مخصوص حکومت کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا

نہ کسی پر تعریض مقصود ہے، میں ایک علمی موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں ——— اس مذہب کے بارے میں واضح فکر ہو جس پر اس کا ایمان ہے، ان مقاصد کے بارے میں واضح فکر ہو جن کو حکومت نے اپنا نصب العین بنایا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ یہ مقاصد زندہ رہیں، نہ صرف زندہ رہیں بلکہ پھلیں پھولیں اسی کو ہم اسلام کی دینی زبان میں ایمان اور عقیدہ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، حکومت کا غیر متزلزل ایمان اور پختہ عقیدہ ہونا چاہیے، اسلام کی برتری پر، ان اعلیٰ مقاصد کی برتری پر جن کی وہ دعوت دیتی ہے، اور جن کے لئے وہ زندہ ہے، اسے جبایت[1] (تحصیل وصول) کے بجائے ہدایت کے اصولوں کا نقیب ہونا چاہیے۔

پھر اخلاص، اولوالعزمی اور جاں نثاری کا جذبہ ہونا چاہیے، یہی تمام عوامل اسلامی شخصیت کی نشوونما، ارتقا، تکمیل اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے مناسب فضا اور مناسب ماحول پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

آخری سوال پیش کرتے ہوئے استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے کہا:

"آخر میں استاذ ابوالحسن سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے تجربوں کی روشنی میں ——— جن سے وہ اپنی جوانی اور کہولت کے دور میں گزرے ہیں، اور اس وقت بڑھاپے کے

---

[1] اس جملہ کی بہترین ترجمانی سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا وہ تاریخی جملہ کرتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک عامل کی اس شکایت پر فرمایا تھا کہ اسلام پھیل جانے کی وجہ سے جزیہ میں کمی ہو گئی ہے، آپ نے فرمایا: جاؤ تمہارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے محصل نہیں بنا کر بھیجے گئے تھے۔

دور میں داخل ہو چکے ہیں ـــــ اس آخری تجویز پر تبصرہ کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ آخر میں نوجوانوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے نوازیں گے۔ اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ استاذ کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے۔

میں نے کہا:-

"میں نوجوانوں کی صلاحیت اور ان کے کردار سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے نوجوان اسلامی دعوت اور اسلامی فکر کے میدان میں کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اس فکری رزمگاہ میں جس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے، وہ بحیثیت مسلم نوجوان کے اپنا رول ادا کرنا چاہتے ہیں۔

حضرات! نوجوانوں میں مختلف طبقے ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی ایک قسم نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جو اپنا رول ادا کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔ ان کے اندر اس کی مکمل صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ موجودہ صورت حال سے ان کو سخت دکھ اور تکلیف ہے۔ یہی نوجوان عالم اسلام کے مستقبل کی امید ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی نوجوان موجودہ فکری دھارے کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ میں اپنی معلومات کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ نوجوانوں میں اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے بہت سا موقع ہے۔ ان کے اندر بے چینی پائی جاتی ہے۔ یہی بے چینی ترقی اور بہتری کی طرف پہلا قدم ہے۔ نوجوان آج پریشان ہیں، بے چین ہیں، مغربی تہذیب ان کو مطمئن کرنے میں ناکام ہو گئی۔ نوجوانوں کی زندگی میں ایک خلا پایا جاتا ہے جو نہ پُر ہوا ہے نہ پُر ہو سکتا ہے، جیسا کہ استاذ کامل الشریف نے فرمایا:

صرف ایک ہی مذہب اس ہولناک خلا کو پر کر سکتا ہے، جو یورپ نے قلب و روح اور جسم و مادہ کے درمیان پیدا کر دیا ہے۔ یہ مغربی تہذیب کی مخصوص چیز تھی جو اپنے طویل سفر میں مخصوص مراحل اور مخصوص تجربوں سے گزری، لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے، اور اسے انسانیت کی بدبختی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب یورپ کو فکری قیادت حاصل ہوئی تو اس کے تجربوں نے ان قوموں کے ذہن پر بھی اثر ڈالا جن کا ان تجربوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ یہ ایک مخصوص معاشرہ کے تجربے تھے جس کے مذہب کا ایک خاص مزاج تھا۔ اس معاشرہ میں کلیسا اور حکومت کے درمیان کشمکش ہوئی، مذہب اور تعلیم کے درمیان کشمکش ہوئی، کہنوت، عقل سلیم اور موجودہ سائنس کے درمیان کشمکش ہوئی۔ یہ تمام تجربے یورپ کے اپنے مخصوص تجربے تھے مشرق ان سے بالکل بے نیاز اور نا آشنا تھا، لیکن یورپ نے اور مغربی تہذیب نے یہ تجربے، ان تجربوں کے اثرات، ان تجربوں کے نتائج اور ان تجربوں کی قدر و قیمت ہر چیز کو مشرقی قوموں پر مسلط کر دیا۔ "مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے" "مذہب و سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں" اور اس طرح کے دوسرے نظریات مغربی قوموں کے تجربات تھے جو مخصوص حالات، مخصوص ماحول اور مغرب کے مذہب یعنی عیسائیت کے مخصوص مزاج کی پیداوار تھے، لیکن مشرقی قوموں نے بغیر کسی سبب اور وجہ جواز کے ان تجربات کو قبول کر لیا، چنانچہ یہ خلا نوجوانوں میں پایا جاتا ہے اور ان کو اس خلا کا احساس بھی ہو چلا ہے، آج ہم کو نوجوانوں کی زندگی میں جو بے راہ روی پائی جاتی

اور ان میں بیداری ابھر رہی ہے۔ وہ اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ میں ایشیا اور مشرق میں اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ نوجوانوں کے اندر اس نئی تحریک کی قیادت اور اس فکری معرکہ میں کودنے کی پوری صلاحیت اور قابلیت موجود ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے اور نوجوانوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے ہم ان سے بے تعلق رہتے ہیں، جس سے دونوں طرف سے بہت غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پائی جاتی ہیں، ہم اس صورت حال سے بالکل ناواقف ہیں جس سے آج کا نوجوان گزر رہا ہے۔ اگر بوڑھوں اور نوجوانوں، مبلغین اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے، ختم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے نوجوان اس دعوت سے متاثر، اس کے مقاصد سے مطمئن اور اس کو فروغ دینے کے لئے سرگرم عمل نہ ہوں، لیکن اس کے لئے بہت نازک، گہری اور باریک علمی منصوبہ بندیوں کی ضرورت ہے۔ ایک نئے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے لئے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کی ضرورت ہے۔ اس حکمت کی ضرورت ہے جس کی جانب قرآن نے اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلائیے
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ؕ	(اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ
(سورۃ النحل — ۱۲۵)	اچھے طریقے سے بحث کیجئے (کہ اس میں
	شدت و خشونت نہ ہو)

اس کے لئے طاقتور ، نفس انگیز و گوہر بار قلم کی ضرورت ہے ، ما فی الضمیر کی ادائیگی پر غیر معمولی قدرت ، ادبی چاشنی ، شیرینی گفتار ، اور اس پُرکشش سحر انگیز اور دلآویز انداز بیان کی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی دعوت نوجوانوں کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتی اور ان کے ذہن و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتی ۔

لیکن سخت افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض محترم اور فاضل علماء زبان و ادب پر عبور حاصل کرنے اور زور بیان اور بلیغ اور دل نشین اسلوب پیدا کرنے کو فضول ، غیر ضروری اور بالکل ضمنی چیز سمجھتے ہیں ان چیزوں کو ہمارے علماء اپنے فرائض سے علیحدہ اور اپنے راستہ سے انحراف سمجھتے ہیں ، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے خود اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور ہم سب کا اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی کتاب کو ایک معجز اسلوب اور عربی مبین میں نازل فرمایا اور یہی نہیں بلکہ اس پہلو کو ایک سے زیادہ جگہوں پر اجاگر بھی کیا ، ارشاد ہے :

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ○ عَلَىٰ	اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے
قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ○	آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ○	تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں
(الشعراء ـ ۱۹۳ ـ ۱۹۵)	کے ہوں ۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ	ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا
تَعْقِلُونَ ○ (یوسف ـ ۲)	تاکہ تم (اہل زبان ہونے کے اولاً) سمجھو

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان، اسلوب اور بلاغت کا پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے، اور جب ہم دعوت وعزیمت اور تجدید واحیائے دین کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ وبرگزیدہ شخصیات جو اخلاص وتقویٰ زہد اور ربانیت وصداقت کے نقطۂ عروج پر تھیں انھوں نے بھی اس پہلو کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی طرف پوری توجہ کی اور اس پر پورا زور دیا، ہم اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال تو نہیں پیش کرنا چاہتے کیونکہ آپ بالاتفاق اور بغیر کسی شک وشبہ کے فصیح ترین اور بلیغ ترین انسان تھے، البتہ ہم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مثال پیش کرتے ہیں جو بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اور اسی طرح تاریخ اسلام کی آخری صدیوں تک نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جن شخصیات کو بھی اسلامی دعوت وتحریک کی قیادت کا منصب حاصل رہا ہے، انھیں اللہ تعالیٰ نے زور بیان، مخاطب کی نفسیات کی فہم اور فصاحت وبلاغت کا بہرۂ وافر عطا کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ جب میں سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات پڑھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں، وہ شخص جو ساری دنیا میں اور ہر دور میں اپنے زہد، قناعت، ربانیت اور تقویٰ کے لئے مشہور رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے دارالحکومت اور عباسی خلافت کے مرکز بغداد میں جہاں حریری، ابن جوزی اور صابی پیدا ہوئے، جہاں بحتری، شریف رضی، متنبی، ابو تمام اور بحتری نے نغمہ سنجیاں کیں، وہی شخص اپنے اس معاشرہ کو ایک سحر انگیز انداز بیان میں مخاطب کرتا ہے ایسے انداز بیان میں جو دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور جس کی تاثیر اور طاقت

آج بھی موجود ہے۔ اسی تاثیر کے پیش نظر حضرت جیلانی کے خطبات کو جمع کرنے والوں نے کوشش کی ہے کہ بعینہٖ ان کے الفاظ بھی ہوں، ورنہ اگر معنوی روایت ہوتی تو یہ خطبے اپنی تاثیر بڑی حد تک کھو دیتے۔

ان سب باتوں سے ادب اور اسلوب کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اگر ہم نوجوانوں کی صحیح اور گہری اسلامی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہم کو نئے علمی و ادبی اسلوب سے مسلح ہونا پڑے گا، تیاری کرنی ہوگی، ان تمام شرطوں کو پورا کرنا ہوگا، جو ہر زمان و مکان کے لئے ہیں، اور جو آج بھی اپنی قیمت اہمیت اور اثر رکھتی ہیں یعنی ایک ایسا علمی اور اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہوگا جو نوجوانوں کے ذہن سے قریب ہو، عقل کو اپیل کرے، جسے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہو بلکہ وہ اس کو پڑھنے کے لئے بیتاب اور بے قرار ہوں، اگر ہم نے یہ شرطیں پوری کرلیں تو مجھے یقین ہے کہ نوجوان صرف یہی نہیں کہ اس نظریہ پر ایمان لائیں گے بلکہ اس کو عام کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کریں گے، اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔"

شام کو وفد نے ایک عشائیہ میں شرکت کی جو عمان میں سعودی قائم مقام سفیر (چارج ڈی افیرس) استاذ محمد سیشہ نے وفد کے اعزاز میں دیا تھا، اس عشائیہ میں علماء عمائدین شہر اور سیاسی حلقہ کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔

عمان سے کرک

اتوار ۱۲؍ اگست ۱۹۷۳ء کا دن، دوروں، ملاقاتوں اور تاریخی مشاہدات کے

اغلباً یہ سارے اردن کے سفر کا مشغول ترین دن تھا۔

صبح ساڑھے ۷ بجے ہم کرک کے لئے روانہ ہوئے، وزارت اوقاف کے سکریٹری استاذ عبد خلف ہمارے ساتھ تھے، وہ تاریخی آثار و مقامات کے سلسلہ میں بہت معلومات رکھتے ہیں، سیرت و تاریخ کا وسیع مطالعہ ہے، ان مقامات پر اکثر جاتے رہتے ہیں اسلئے ان کی بستی ان مقامات کے قریب ہی ہیں ہے، آثار قدیمہ کے مشہور ماہر استاذ رفیق وفا دجانی جن کا نام کہف کے دورہ میں گزر چکا ہے۔ کی رفاقت سے اس دورہ کی علمی اور تاریخی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا، تفریح کے ساتھ ساتھ تحقیق اور عبرت پذیری کے مواقع بھی ملے، اور ان بہت سی چیزوں کی وضاحت ہوئی جو ہم نے سیرت و تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھی تھیں، اور جن کی حقیقت تک پہنچنا، صاحب اختصاص حضرات کی رہنمائی میں ان مقامات کو آنکھوں سے دیکھے بغیر ممکن نہیں تھا، پہ اس کتابیں پڑھنے سے بھی اتنی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں، جو اس مختصر دورہ میں حاصل ہو گئیں، مزید برآں ان مقامات کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دل میں جو اثر ہوتا ہے، اور جو احساسات ابھرتے ہیں، وہ ان کے بارے میں کسی کتاب کے مطالعہ سے نہیں ابھر سکتے، پرانی مثل ہے،

”شنیدہ کے بود مانند دیدہ“

فوج کے سامنے تقریر

سب سے پہلے ہم ایک اسلامی حکومت کی مسلح فوجوں کے ایک مرکز کو دیکھنے گئے عمان میں جب ہم تھے، اسی وقت ہم سے اس چھاؤنی کو دیکھنے اور ایک اہم اور نازک سرحد پر تعینات فوجیوں سے خطاب کرنے کی فرمائش کی گئی تھی، اور ہم نے اس علاقہ کے رہنماؤں

اعتماد اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کی مسلح فوجوں سے ملاقات اور ان سرفروش مجاہدین سے خطاب کر رہا تھا جنہوں نے اپنی زندگی اسلام اور اسلامی مملکت کے دفاع، اسلامی مقدسات کے تحفظ اور اپنی جانب سے ہر آنے والے خطرہ کے مقابلہ کے لئے وقف کر دی ہے۔

جب مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور اسلامی طریقے کے مطابق ہم کو سلامی دی ــــ اور یہ منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا ــــ تو میرے جسم میں تازہ ایمان اور سرخوشی و سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی، اور طرب وابتہاج کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی، اس کیفیت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میری طبیعت رواں ہو گئی اور زبان ذہن سے پہلے زبانِ دل سے گفتگو شروع کرتے ہوئے میں نے کہا:۔

> "میرا نشوونما ایک علمی اور دینی ماحول میں ہوا ہے، مجھے صاحب فکر، صاحب علم اور اہل قلم حضرات کی صحبت سے فیضیاب ہونے اور بے شمار ایسے اجتماعات اور مجالس میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے جن میں علماء اور مفکرین کی کثرت ہوتی تھی اور جن میں بہت سی یکتائے روزگار شخصیات جلوہ افروز ہوتی تھیں، لیکن آج جو سرشاری، جو رقت، جو خشوع اور جو سعادت و لذت محسوس کر رہا ہوں، وہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی ــــ اگر میرے بس میں ہوتا ــــ اور اس کی اجازت ہوتی۔ تو میں آپ میں سے ہر فوجی کی دست بوسی کی کوشش کرتا کیونکہ آپ کا ہاتھ اسلام کے لئے برسر پیکار ہے، آپ کا ہاتھ اس لئے ہتھیار پکڑتا ہے کہ اسلام اور

مسلمانوں کی مدافعت کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ	برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر
الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ	کے گھر میں بیٹھے رہیں اور وہ لوگ جو
وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فَضَّلَ	سے جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان
اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ	لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے
وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ	جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد
دَرَجَةً۔ (النساء ـ ۹۵)	کرتے ہیں، بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے

آپ اسلامی ممالک کے پاسبان ہیں، مسلمان عورتوں اور بچوں کی عزت و آبرو کے نگہبان ہیں، ان مسجدوں کے تقدس اور ان دینی اداروں اور تعلیم گاہوں کے سکون کے محافظ ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے، اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے، علم کی اشاعت ہوتی ہے، فرائض و سنن کی تعلیم ہوتی ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاح احوال ہوتی ہے ـــــ اسلامی سرحدوں کے پاسبانو اور نگہبانو! اگر آپ نہ ہوتے، آپ کی جانبازی اور سرفروشی نہ ہوتی اور آپ کی شجاعت و جوانمردی نہ ہوتی تو موذنوں کے لئے اذان کی آواز بلند کرنا ناممکن ہو جاتا، نمازیوں کے لئے خدا کے گھر میں فرض کی ادائیگی مشکل ہو جاتی، علم کی اشاعت اور اس امانت کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا کوئی مرکز نہ ہوتا، بوڑھوں، عورتوں اور کمزوروں پر سکون کی نیند حرام ہو جاتی، تاجروں کو اپنی تجارت اور

پیشہ وروں کو اپنے پیشوں سے اشتغال و شغف رہتا ہے، مذہبی شعار، ہر علمی مصروفیت اور زندگی کے ہر عمل پر آپ کا احسان ہے خواہ کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے:-

عینان لا تمسهما النار عین بکت من خشیة الله وعین باتت تحرس فی سبیل الله[1]	دو آنکھوں کو جہنم کی لپٹ نہیں پہنچ سکے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی ہو اور ایک وہ آنکھ جو رات بھر اللہ کی راہ میں پہرہ دیتی ہو

دوسری حدیث میں ہے:-

ما اغبرت قدما عبد فی سبیل الله فتمسه النار[2]	جو قدم بھی اللہ کی راہ میں گرد آلود ہوئے ان کے لئے آگ حرام ہوگئی۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:-

رباط یوم فی سبیل الله خیر من الدنیا وما علیها۔[3]	اللہ کے راستے میں ایک دن کا پہرہ اور سرحد کی حفاظت دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے

ایک روایت میں ہے:-

غدوة فی سبیل الله او روحة خیر من الدنیا وما فیها۔[4]	اللہ کے راستہ میں ایک صبح کا نکلنا یا ایک شام کا نکلنا دنیا و ما فیہا سے اعلیٰ و افضل ہے۔

---

[1] ترمذی عن ابن عباس مرفوعاً۔ [2] بخاری، ترمذی، نسائی عن ابی عبس مرفوعاً۔

[3] متفق علیہ [4] ایضاً

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو اسلام کے کوہان کا بالائی حصہ (سب سے بلند مرتبہ) قرار دیا ہے، چنانچہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:۔

ألا أدلك برأس الأمر وعموده
وذروة سنامه؟ قلت: بلى
يا رسول الله! قال: رأس
الأمر الإسلام، وعموده الصلوٰة
وذروة سنامه الجهاد۔[لہ]

بھلا میں تم کو اصل الاصول دین کا
ستون اور اس کی چوٹی کی چیز بتاؤں
میں نے کہا: ضرور بتائیے، ارشاد ہو
آپ نے فرمایا: اصل الاصول تو
اسلام ہے اور اس کا ستون نماز
ہے اور اس کی چوٹی کی چیز جہاد ہے

میں نے ان کے سامنے برصغیر کی تاریخ جہاد سے، تیرھویں صدی ہجری میں توحید و جہاد کے علمبردار اور دعوت و اصلاح کی سب سے بڑی جدوجہد کے قائد حضرت سید احمد شہیدؒ کا ایک واقعہ پیش کیا، کہ ایک بار مجاہدین اپنے امیر حضرت سید احمدؒ کی قیادت میں ایک معرکہ سے مظفر و منصور واپس آئے، ان کے چہرے غبار آلود اور ان کے کپڑے گرد سے اٹے ہوئے تھے یہاں تک کہ پہچانے نہیں جاتے تھے، سردار بہرام خاں ... ایک والی ملک

[لہ] ترمذی، احمد، ابن ماجہ عن معاذ بن جبل مرفوعاً۔ یہ ایک طویل حدیث ہے، حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تقریر میں ہم نے ان احادیث کا مفہوم بیان کیا تھا، مگر جب قلمبند کرنا ہوا تو اصول سے مراجعت کر کے اصل احادیث کے الفاظ کو نقل کیا اور اس مضمون کی بعض اور احادیث کا اضافہ بھی کر دیا۔

دھیرے کے چہرہ سے گرد جھاڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تو حضرت سید احمدؒ نے کہا پٹھان بھائی ذرا ٹھہرو یہ وہی غبار ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا یجتمع غبار فی سبیل اللہ	اللہ کی راہ کا غبار اور جہنم کا دھواں
ودخان جہنم[۱]	دونوں جمع نہیں ہوں گے۔

ہمارے یہاں آنے اور ان مصیبتوں کو برداشت کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس غبار کو حاصل کریں گے، تو پٹھان بھائی ذرا صبر کیا تنی عجلت کی ضرورت نہیں۔

اور مجاہدین ٹھہر گئے اور اس وقت اس غبار کو نہیں جھاڑا۔[۲]

پھر میں نے ان نوجوانوں کو دو اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔

پہلی بات تو یہ کہ نیت میں خلوص ہو مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ اور رضائے الٰہی کا حصول ہو، اور اس شجاعت و جوانمردی کے پیچھے کوئی اور غرض کارفرما نہ ہو، میں نے ان کے سامنے وہ مشہور حدیث پیش کی جو صحاح میں وارد ہوئی ہے۔

سئل رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
علیہ وسلم عن الرجل یقاتل	دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری
شجاعۃ، ویقاتل حمیۃ، ویقاتل	کی وجہ سے جنگ کرتا ہے ایک شخص
ریاء ای ذلک فی سبیل اللہ	حمیت وغیرت میں آکر جنگ لڑتا ہے

---

[۱] سنن [۲] سیرت سید احمد شہیدؒ جلد دوم (لاہور ایڈیشن)

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔[1]

ایک شخص دکھاوے کے لئے جنگ کرتا ہے ان میں سے کون اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا شمار ہوگا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو صرف اس لئے جنگ کرے کہ اللہ کا بول بالا ہو وہی اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا شمار ہوگا۔

دوسری چیز جس کی طرف میں نے توجہ دلائی وہ معاصی اور برائیوں سے اجتناب جو اللہ تعالے کے غضب کا باعث اور نصرت الہی کے تعلق کے خلاف ہو۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ایک خط لکھا تھا جس میں فرمایا تھا کہ دشمن کی قوت و کثرت اور اسلحہ سے اتنا نہ ڈرے جتنا گناہوں اور خدا کی نافرمانی سے ڈرے کیونکہ میرے نزدیک لوگوں کے گناہ دشمن کی چالوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔[2]

حاضرین پر تقریر کا گہرا اثر ہوا، تقریر ریکارڈ کی گئی، میرا خیال ہے کہ پورے اسلامی ملک میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلح افواج کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے اور جہاد کا اللہ تعالے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جو مرتبہ اور مقام ہے، اور شہادت کی جو فضیلت اور عند اللہ شہداء کا جو ثواب اور اجر ہے اس کو ان کے سامنے اجاگر کیا جائے، اس عظیم اور غیر معمولی طاقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اسلامی

---

[1] متفق علیہ [2] سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن عبدالحکم۔

مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچا ہے اور اسلامی حکومتوں اور ان کی جنگی اور مادی طاقت اور غیر اسلامی حکومتوں اور ان کی جنگی اور مادی طاقت کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا جبکہ بنیادی اور اسلامی حکومتوں کے درمیان امتیاز یہی تھا کہ مسلمان جب جنگ کرتے ہیں تو اس کے پیچھے ان کا ایمان و احتساب کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور وہ عنداللہ اجر و ثواب کے امیدوار ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے مومنین اولین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا
تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ
وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ (النساء۔ ١٠٤)

اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا اگر تم بے آرام
ہوتے ہو تو جس طرح تم بے آرام ہوتے ہو اسی طرح
وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں اور تم خدا سے ایسی ایسی
امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے اور خدا
سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے۔

میرے بعد استاذ محمد احمد جمال کی باری آئی استاذ جمال قرآنی آیات کے استحضار و انتخاب میں امتیاز رکھتے ہیں اور بہت سی احادیث کے متون ان کو زبانی یاد ہیں چنانچہ انھوں نے جہاد اور شہادت کے بارے میں بہت سی آیات و احادیث سے حسب موقع استشہاد کرتے ہوئے ایک فاضلانہ تقریر کی جس نے حاضرین سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم اس فوجی مرکز سے روانہ ہوئے تو ہم ان کی عزت افزائی سے مسرور اور اس اسلامی جذبے سے سرشار تھے جو اس علاقہ پر اور اس کے باشندوں پر سایہ فگن تھا اور اپنے فوجی بھائیوں کی کامیابی اور نصرت الٰہی کے لئے دل سے دعا کر رہے تھے۔

کچھ دیر شہداء موتہ کے مرقد پر

اور آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ موتہ پہنچے یہ وہی موتہ ہے جس کی جانب

ایک عظیم اسلامی جنگ منسوب ہے جس کے حالات و واقعات ہم اسلامی سیرت، تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اس معرکہ میں مسلمانوں نے غیر معمولی شجاعت و جوانمردی کا ثبوت دیا تھا۔ موتہ کرک کے جنوب میں ۱۲ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ایک کشادہ میدان میں واقع ہے۔

غزوہ موتہ سنہ ۸ھ میں پیش آیا تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد ۳ ہزار اور رومیوں اور عیسائی عربوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۲ لاکھ تھی۔ حضرت زید بن حارثہؓ اس جنگ میں شہید ہوئے تھے، جو اس وقت مشہد کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت زیدؓ کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے علم اٹھایا۔ داہنا ہاتھ کٹ کر گرا تو بائیں ہاتھ میں علم لے لیا، وہ بھی کٹ گیا تو دونوں بازوؤں سے اس کو تھام لیا اور برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ اسی موقع پر آپ کو جعفر طیارؓ اور ذوالجناحین کا لقب ملا۔ آپ کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے علم لیا اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ کے بعد مسلمانوں نے بالاتفاق حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو علم دیا اور آپ غیر معمولی شجاعت اور جانبازی سے لڑتے رہے یہاں تک کہ رات ہو گئی اور رومی شمال کی طرف اور مسلمان جنوب کی طرف چلے گئے —[1] اور دونوں فوجوں نے صبح تک کے لیے ہتھیار رکھ دیے۔ اس اثناء میں حضرت خالدؓ نے ایک اسکیم تیار کی اور اپنے لشکر کی ایک بڑی تعداد کو اپنی فوج کے پیچھے ایک لمبی لائن پر تعینات کر دیا جنہوں نے صبح ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ دشمن نے سمجھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تازہ کمک پہنچی ہے۔ اور جب پہلے روز صرف ۳ ہزار افراد نے رومیوں کے چھکے چھڑا دیے تھے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیے تھے تو تازہ کمک تو غضب

---

[1] واقعہ کی تفصیلات اور اسباب معلوم کرنے کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام حصہ سوم ص [illegible] تا [illegible] طبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، دوسرا ایڈیشن۔ سیرت و مغازی کی دوسری کتابوں میں بھی تفصیل موجود ہے۔

ان کے ساتھ کیا کریں گے جن کی تعداد بھی کسی کو معلوم نہ تھی۔ یہ سوچ کر رومیوں نے حضرت خالدؓ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی اور ان کو خوشی ہوئی کہ حضرت خالد نے بھی ان پر حملہ نہیں کیا۔ اس سے زیادہ رومیوں کو اس پر خوشی تھی کہ حضرت خالد اور ان کے ساتھی، مدینہ واپس چلے گئے اور جنگ میں ان کو فتح نہیں حاصل ہو سکی، اگرچہ رومیوں کو بھی فتح نہیں حاصل ہوئی تھی۔

ہم اس جگہ پر کچھ دیر خاموش اور سر جھکائے کھڑے رہے۔ اور ان جانبازوں کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی پر محو حیرت تھے، جو مدینہ سے موتہ موآب کے علاقہ میں آئے تھے، اس علاقہ میں جو دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت کے زیر نگیں تھا، فوج، رسد اور جنگی وسائل کے اعتبار سے یہ سلطنت دنیا کی دوسری تمام حکومتوں پر فوقیت رکھتی تھی مدینہ اور موتہ کے درمیان تقریباً ۱۰۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ یہ طویل مسافت اسلام کے مجاہدوں نے اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ طے کی، اور مدینہ سے نکلنے کے بعد ان کو کمک یا رسد اور دارالخلافہ سے ان کا کوئی رابطہ باقی رہ گیا تھا، اور وہ دشمن کے جبڑوں میں داخل ہو رہے تھے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے۔

"پھر وہ آگے بڑھے اور ملک شام میں معان کے مقام پر قیام کیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہرقل بلقاء کے علاقہ سے ایک لاکھ رومیوں کو لیکر مآب پہنچ چکا ہے۔ اور لخم، جذام، قین بہراء اور بلی کے قبائل کے ایک لاکھ افراد بھی اس کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا تو وہ دو دن معان میں ٹھہرے صورت حال پر غور کرتے رہے۔ اور انھوں نے کہا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لکھا جائے۔ اور آپ کو دشمن کی تعداد کی اطلاع کی جائے تو آپ یا تو کمک روانہ فرمائیں ورنہ جو حکم دیں۔ اس کے مطابق ہم عمل کریں، اسکے بعد

لہ حیاۃ محمد از ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ص ۳۷۷

حضرت عبداللہ بن رواحہ نے لوگوں کو جوش دلایا۔ آپ نے کہا: لوگو! تم جس سے گھبرا رہے ہو وہ چیز تو وہ ہے جس کے لئے تم یہاں آئے ہو یعنی شہادت۔ ہم لوگوں سے تعداد کی کثرت اور طاقت کے سہارے جنگ نہیں کرتے۔ ہم تو اس دین کے ذریعہ جنگ کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو نوازا ہے۔ پس چلو، دو نعمتوں میں سے ایک تو ضرور ہی ملے گی غلبہ یا شہادت۔ تو لوگوں نے کہا: خدا کی قسم ابن رواحہ نے بالکل صحیح بات کہی، اور لوگ نکل پڑے۔[1]

اور پھر جنگ ہوئی مسلمانوں کے تینوں سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ اسے کہتے ہیں، مومن عقل اور مومنانہ انداز فکر، جو مومنین اولین میں بدرجہ اتم موجود تھا، اور جس سے بعد کے مسلمان محروم ہو گئے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے ماضی اور حال کے درمیان اتنا نمایاں اور واضح فرق ہو گیا ہے۔

ہم نے تینوں سپہ سالاروں کی قبروں کی زیارت کی۔ یہ حضرات اپنی شہادت کے مقام ہی پر مدفون ہیں۔ سیدنا جعفر بن ابی طالب کی مسجد بھی دیکھی، اور آپ کے مزار پر آپ کی بے نظیر شجاعت کے کارناموں کو یاد کرتے رہے۔ یہ مسجد اور مزاروں پر بلند گنبدوں کی تعمیر ترکی دور میں ہوئی تھی۔ محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے سیاحوں کو جو پمفلٹ دیئے جاتے ہیں ان میں ان مزارات کی تاریخ اور ان کے متعلق ساری تفصیلات درج ہوئی ہیں۔ ان مزارات پر جس وقت ہم فاتحہ پڑھ رہے تھے اپنا وجود ہم کو بہت حقیر اور بے حیثیت نظر آرہا تھا۔

موتہ کے تاریخی مقامات

سیدنا حضرت جعفرؓ کی مسجد کے پاس ایک اسلامی میوزیم ہے، جو ابھی تکمیل کے مرحلہ

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ سوم ص ۲۰۵

ہیں اور بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اس میں اسلامی آثار، مخطوطات رکھے گئے ہیں۔ میوزیم کا انتظام وزارت اوقاف کے ذمہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میوزیم کی تاریخ پرانی ہے اور اس کو الملک الناصر محمد بن قلاوون کے عہد میں شوبک اور کرک کے نائب السلطنت بہادر البدر الملکی الناصری نے ۷۲۳ھ میں تعمیر کیا تھا۔ میوزیم میں استاذ محمود الافغانی وغیرہ کے جمع کئے ہوئے اسلامی آثار بھی ہیں۔

بترا کا سفر

موتہ سے ہم نے بترا اور معان کا رخ کیا۔ راستہ میں "عفرا" نامی بستی سے گزرے۔ وہاں کا پانی معدہ کی اصلاح اور ریگ و پتھری کے امراض کے لئے مشہور سمجھا جاتا ہے اور دور دور سے لوگ پینے کے لئے آتے ہیں۔ "طفیلہ" نامی بستی سے بھی گزر ہوا اور کچھ وقت شوبک میں گزارا اور وہاں کا زراعتی اسکول دیکھا اور وادی عربہ سے بھی گزرے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور عصر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد ایک سیاحتی اور تاریخی دورہ کے لئے جانا تھا جس کے لئے چستی اور نشاط کی ضرورت تھی اور پھر بترا[1] کے لئے روانہ ہو گئے۔ بترا قدیم تاریخی شہر ہے جس کی تاریخ ——

---

[1] اردن کے لوگ اسی طرح بولتے ہیں لیکن قدیم مورخین اور جغرافیہ دانوں نے اس کو "بطرا" اور "بطرہ" ضبط کیا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہاں وہ مقام ہے جس کو عبرانیوں نے "سلع" لکھا ہے اور جس کا ذکر اشعیا ۱-۱۶ اور ملوک ۲-۱۴:۷ میں آیا ہے۔ اور یہی وہ چٹانی عربی قصبہ ہے جو یونانیوں اور رومیوں کے یہاں بہت مشہور تھا۔ نبطیوں نے جو عربی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ہزاروں سال پہلے اس شہر کو قائم کیا تھا۔ تہذیب و تمدن میں انھوں نے بہت ترقی کر لی تھی۔ ان کی زبان آرامی تھی

ہزاروں سال پرانی ہے، عرب نبطیوں نے یہ شہر آباد کیا تھا، حجر اور مدائن صالح کی طرح یہ شہر بھی پہاڑوں کے اندر کھود کر بنایا گیا تھا، بعض ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ آثار سنگ تراشی، ترتیب، تحسین اور سلیقہ مندی، کاریگری کے اعتبار سے ثمود کے آثار سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں

ہماری کار دیر ایک لمبی اور کھلی سرنگ سے ہوتی ہوئی پہاڑ میں تراشے ہوئے ایک راستے سے گزری جو کئی کیلو میٹر لمبا تھا اور بار بار مڑتا تھا، اور اس کے دونوں طرف دو اونچے پہاڑ تھے، پھر ہم ایک شہر میں داخل ہوئے جس میں تہذیب و تمدن کے تمام مظاہر موجود ہیں، محل، ایوان، بازار، عدالت اور پختہ سڑکیں سب پہاڑ کو تراش کر بنائی گئی ہیں، ہماری رہنمائی استاذ رضی وفا دجانی کر رہے تھے، وہ ان تمام آثار، ان کی تعمیر اور ان کے مقاصد کی وضاحت کرتے جاتے تھے، اگر وہ نہ ہوتے تو ہمارے لئے یہ تاریخی دورہ کچھ زیادہ مفید نہ ثابت ہوتا اور اس سے زیادہ کچھ احساس نہ ہوتا کہ ہم ایک تنگ و تاریک سرنگ میں چل رہے ہیں۔

اس وسیع شہر کو ہم مکمل طور پر نہ دیکھ سکے اور نہ ہمارے لئے اس مختصر وقت میں یہ ممکن تھا، اس لئے کہ بتراء کا رقبہ ۳۰ کیلو میٹر مربع ہے، بہرحال یہ سفر معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز اور سبق آموز بھی تھا، اور ہم کو آیت کریمہ۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فَارِهِيْنَ۔ (الشعراء ـ ۱۴۹)
اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

(ان میں کافی) شعراء، اطباء اور بڑے بڑے تاجر تھے جو مصر، شام اور فرات و دجلہ کے علاقوں کا سفر کرتے رہتے تھے، اس کے باوجود وہ بت پرست تھے، لات جس کو شمالی حجاز کے لوگ اٹھا لائے تھے اور حجاز کے بیان مرکزی حیثیت رکھتا تھا، انھیں نبطیوں کے بتوں میں سے ایک تھا۔

کی مکمل تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔

رات میں عمان واپس آئے، بہت طویل فاصلہ طے کرنا پڑا تھا، اس سے پہلے ہم نے کار سے ایک روز میں اتنا طویل فاصلہ کبھی طے نہیں کیا تھا، اور ہمارے ذہن میں معلومات، تاثرات اور یادوں کا ایک ہجوم تھا۔

عمان سے روانگی

۲۰ اگست ۱۹۷۳ء دوشنبہ کے روز ہم کو عمان سے ہندوستان کے لئے روانہ ہونا تھا طیارہ کی روانگی کا وقت شام کو تقریباً ساڑھے سات بجے تھا۔ جو احباب آخری ملاقات کے لئے تشریف لائے ان میں شیخ اسعد الحسینی سابق خطیب مسجد اقصیٰ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، شیخ بھی ہمارے ساتھ رہے، انھوں نے بیت المقدس کے یہودیوں کے قبضہ میں جانے کے بعد کے حالات اور عرب رہنماؤں کی کمزوری و بے حسی کے واقعات سنائے، ان کی گفتگو بڑی موثر اور رقت انگیز تھی، اسی طرح رابطہ علوم اسلامیہ کے صدر استاذ تیسیر ظبیان اہل علم کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے، قبرص کے ایک ترکی وفد نے بھی ہم سے ملاقات کی اور اس ملک کی موجودہ صورت حال کی وضاحت کی جو ایک سنگین جمہوری مرحلہ سے گزر رہا ہے، اور جہاں ترک مسلمان اپنی اسلامی شخصیت و انفرادیت اور اپنے قومی وجود کے تحفظ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

استاذ کامل الشریف نے موتمر اسلامی کی جانب سے وفد کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا، جس میں بعض ان علمی و دینی شخصیات سے ملنے کا اتفاق ہوا جن سے اس مختصر دورہ میں پروگرام کے ہجوم کی وجہ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، مثلاً کلیۃ الشریعہ کے پرنسپل شیخ عبدالعزیز خیاط[1] وغیرہ

---

[1] موجودہ وزیر اوقاف اردن۔

ہمارے محترم میزبان ڈاکٹر اسحاق فرحان ہم کو رخصت کرنے کے لئے ہوٹل تشریف لائے آپ کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے اساتذہ اور معزز حضرات آگئے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہوگئے، ہمارے فاضل دوست اور رفیق وفد ڈاکٹر عبداللہ عزام جن کا ہمارے دلوں پر بہت گہرا اور خوشگوار اثر ہے ہمارے دیرینہ رفیق ڈاکٹر ادیب صالح ایڈیٹر رسالہ حضارۃ الاسلام اور شام یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ کے استاذ جو ان دنوں کلیۃ الشریعۃ عمان میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اور جن سے ایک طویل وقفہ کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی سعودی قائم مقام سفیر استاذ محمد عیش اور استاذ کامل الشریف نے وفد کو رخصت کیا اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔

اشاریہ

(انڈکس)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

اشخاص

(الف)

(سیدنا حضرت) ابراہیم علیہ السلام — ۱۰۵
(حضرت عبداللہ) ابن عباسؓ — ۲۹۹
(حضرت) ابوبکر صدیقؓ — ۲۸
(ام المؤمنین حضرت) ام سلمہؓ — ۱۰۴
ابراہیم حسنو — ۲۱۸
(شیخ محمد) ابراہیم شقرہ — ۲۴، ۲۵۱، ۲۵۹
(شیخ محمد) ابراہیم عبدوی — ۴۳
ابلیس — ۱۴
(شیخ الاسلام) ابن تیمیہ حرانی — ۱۴۴
(علامہ) ابن جوزی — ۱۸۸، ۲۹۴
ابن الجہم — ۲۰۱
ابن خلکان — ۸۹
(علامہ) ابن عابدین (صاحب شامی) — ۱۸۱
(علامہ) ابن قیم — ۴۲
ابو اسحاق شیرازی — ۹۳
(مولانا) ابوالاعلیٰ مودودی — ۷۴، ۹۴
ابوبکر رازی — ۸۳
ابوبکر رازی طبیب — ۸۳
(متکلم) ابوبکر محمد بن فورک — ۹۰
ابوتمام طائی — ۱۳۰، ۱۳۴، ۲۶۴
(مولانا) ابوالحسن علی ندوی — ۱۲، ۲۵۸، ۲۵۹
(امام) ابوحنیفہؒ — ۱۳۰، ۱۹۰
(امام) ابوداؤد ظاہری — ۹۰
ابوریحان بیرونی — ۴۸، ۲۵۰
ابوالعلاء المعری — ۴۹، ۲۰۳، ۲۶۴
(حضرت) ابو عبسؓ — ۲۹۹
ابوالفرج اصفہانی — ۹۰، ۱۸۸
ابونعیم اصفہانی — ۹۰، ۱۸۸
ابوالقاسم قشیری — ۸۰
(مولانا) ابوالکلام آزاد — ۹۴
ابویزید بسطامی — ۱۳۰
(ڈاکٹر) ابوالیسر عابدین — ۱۸۱
(امام) ابویوسفؒ — ۱۹۰
(محمد) اجمل اصلاحی ندوی — ۱۹، ۱۴۷، ۲۱۵
(امام) احمد بن حنبلؒ — ۸، ۱۸، ۲۰۵
احمد الجوہری — ۱۹۱
احمد حسن بکر (صدر جمہوریہ عراق) — ۱۹۰

(شیخ) احمد الدقر ——— ۱۸۱
(شیخ) احمد سرہندی (مجدد الف ثانیؒ) ۴۸، ۱۴۴
احمد شاہ ابدالی ——— ۱۸، ۱۹، ۲۰
(حضرت سید) احمد شہیدؒ ۲۲، ۲۳، ۲۷۰، ۲۷۱
(مفتی شیخ) احمد کفتارو ——— ۱۴۳، ۱۷۰
احمد محمد جمال ـ ۲۲، ۲۵، ۲۸ـ۳۰، ۳۲، ۳۴،
۳۸، ۳۹، ۴۵، ۵۶، ۱۱۷، ۱۳۰،
۱۵۳، ۱۸۲، ۲۴۲، ۲۵۱، ۲۷۳
(سیدنا) احنف بن قیس ——— ۲۰۵
ادیب نشتگلی ——— ۱۲۷
ادیب صابر ——— ۲۸۰
ازموں ملاحظہ ہو ——— منوچہر
اسحاق قرمان ـ ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۸، ۲۸۰
(محمد) اسد (سابق لیوپولڈ) ——— ۱۹۹
اسدی ——— ۴۸
اسعد الگیلانی ——— ۲۷۹
اسماعیل صفوی ——— ۹۰
(ڈاکٹر سر محمد) اقبال ـ ۱۲، ۲۵، ۳۱، ۵۰،
۶۹، ۷۰، ۸۵، ۱۱۳، ۱۱۹
(امیر) امان اللہ خان ـ ۱۹، ۲۰، ۳۱، ۴۱، ۴۳
امین بروسک ——— ۲۳۹، ۲۴۰
(مفتی) امین الحسینیؒ ——— ۱۳۶
امین ریحانی ——— ۱۳۵
(میر) انیس ——— ۱۰۵
(مفتی محمد) انیس محمود ——— ۱۴۲
(امام عبدالرحمٰن) اوزاعیؒ ——— ۱۳، ۱۴۳

ب پ

بابر ——— ملاحظہ ہو ——— ظہیر الدین
بچہ سقہ ——— ملاحظہ ہو ——— حبیب اللہ
بحتری ——— ۱۳، ۲۶۴
بخت نصر ——— ۹۴
بدیع الزمان ہمدانی ——— ۴۸
برہان الدین ربانی ——— ۲۷
بشار ——— ۳۸
(قاضی) بشیر ابہانی ——— ۱۴۳
(مؤرخ) بغدادی ——— ۸۹
(محمد) بہجۃ البیطار ——— ۱۸۱
(خواجہ) بختیار ——— ۵۰
بہادر البیدا الملکی الناصری ——— ۲۷۷
(ارباب) بہرام خان ——— ۲۷۰
(سلطان) بہرام شاہ ——— ۴۸، ۴۹
(سید) بہلول دانا ——— ۵۰
(پروفیسر) بجوپ (امریکی مستشرق) ——— ۸۷

ت

تاج الدین سبکی ——— ۸۷
(حاجی) ترنگزئی ——— ۴۴

تقی الدین الصلح ـــــــ ۱۵۳
(آیت اللہ محمد) تقی بافقی ـــــــ ۸۲، ۸۵، ۱۰۲
تیمیر طیبیان ـــــــ ۲۳۹، ۲۷۹

ج

(حضرت) جعفر بن ابی طالبؓ ـــــــ ۲۷۳، ۲۷۹
جعفر کتانی ـــــــ ۱۸۰

ح

(حضرت) حسین بن علیؓ ـــــــ ۱۰۵
(حضرت) حذیفہ بن یمانؓ ـــــــ ۱۹۳
(خواجہ) حافظ ـــــــ ۸۰، ۹۲
حبیب اللہ (بچہ سقہ) ـــــــ ۲۰
(امیر) حبیب اللہ خان ـــــــ ۱۹
(آیۃ اللہ) حبیب اللہ خیابانی ـــــــ ۸۴، ۸۵
حریری ـــــــ ۲۶۴
(آیۃ اللہ) حسن امامی ـــــــ ۸۲
(امام) حسن بصریؒ ـــــــ ۱۳۴، ۲۱۳
حسن البنا شہیدؒ ـــــــ ۱۳۲
حسن اتل ـــــــ ۲۱۹
حسن جنگی ـــــــ ۱۶۹
(مفتی شیخ) حسن تقالہ ـــــــ ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۸۸، ۱۹۰
(شاہ) حسین ـــــــ ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳
حسین البصری ـــــــ ۱۳۹، ۱۴۰
حسین الشامی ـــــــ ۱۹۱
حسین قوتلی ـــــــ ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۸
(مفتی) حسنین محمد مخلوف ـــــــ ۱۳۱
(ڈاکٹر) حسین نصر ـــــــ ۸۲
(ڈاکٹر محمد) حسین ہیکل ـــــــ ۲۷۵
(مسٹر) حنیف محمد حنیف ـــــــ ۴۳

خ

(حضرت) خالد بن ولیدؓ ـــــــ ۲۷۳، ۲۷۵
(شیخ) خلیل ـــــــ ۱۳۳، ۱۳۴
(پروفیسر) خلیق احمد نظامی ـــــــ ۱۹
خلیل عنانی ـــــــ ۱۳۲

د ذ

دارائے اول ـــــــ ۱۹۳
(سردار) داؤد خان ـــــــ ۵۲، ۵۳
(مرزا) دبیر ـــــــ ۱۰۵
ذوالقرنین ـــــــ ۹۴

ر

(امام) راغب اصفہانی ـــــــ ۹۰
(مولانا) رشید احمد گنگوہیؒ ـــــــ ۱۴۳
رشید میقاتی ـــــــ ۱۳۱
رفیع وفا دہانی ـــــــ ۲۳۹، ۲۶۶، ۲۷۸

ز

(حضرت) زید بن حارثہؓ ـــــــ ۲۷۴، ۲۷۹
زاہد کشتاپد ـــــــ ۱۴۳

(ڈاکٹر) زویمر ــــــ ۸۷
زہیر شاویش ــــــ ۱۶۱
(شیخ) زین العابدین ــــــ ۱۸۱

س

(حضرت) سعد ابن ابی وقاصؓ ــــــ ۹۷
(حضرت) سلمان فارسیؓ ــــــ ۲۷، ۱۹۵
سائغ ہروی (مؤرخ) ــــــ ۲۵۰
(شہنشاہ) سائرس اعظم ــــــ ۹۳
(شیخ) سعدیؒ ــــــ ۸۰، ۹۲
سعدی یاسین ــــــ ۲۴، ۱۳۲
(ڈاکٹر) سعد الراوی ــــــ ۱۹۴
(ڈاکٹر) سعید رمضان ــــــ ۲۲۷
(شیخ) سعید الشانی ــــــ ۱۳۴
(مولانا سید) سلیمان ندوی ــــــ ۲۱، ۲۵، ۳۶
(شیخ) سلیم جلال الدین ــــــ ۱۴۵
سلیم سوسان ــــــ ۱۴۲
سمیع الدین زونہ ــــــ ۳۹
(حکیم محمود) سنائی ــــــ ۳۶، ۳۹، ۵۰
(امام) سیبویہ ــــــ ۱۳۰
(سلطان) سیف الدین ــــــ ۲۸
(مولانا) سیف الرحمٰن ٹونکی ــــــ ۳۴

ش

(شہنشاہ) شاہجہاں ــــــ ۸۸
شریعتمداری ــــــ ملاحظہ ہو ــــــ کاظم
شریف رضی ــــــ ۲۹۴
شکری القوتلی بے ــــــ ۱۹۷
(امیر) شکیب ارسلان ــــــ ۱۵، ۲۶
شمس الحق ندوی ــــــ ۱۱
شمس العارفین ــــــ ۵۰
(احمد) شوقی ــــــ ۱۹۶، ۱۴۳
(سلطان) شہاب الدین غوری ــــــ ۴۸، ۶۰
(پروفیسر) شیخ الاسلام ــــــ ۸۳

ص ض

(ابو اسحاق) صابی ــــــ ۲۶۴
(شیخ محمد) صادق مجددی ــــــ ۲۴۲، ۲۴۳
صالح بن شریف رندی ــــــ ۲۴۲
(شیخ محمد) صالح قزاز ــــــ ۲۴
صاوی شعلان (شاعر) ــــــ ۸۵
صائب سلام ــــــ ۱۵۳
(ڈاکٹر) صبحی صالح ــــــ ۱۵۳
صبغۃ اللہ مجددی ــــــ ۲۴۳، ۱۳۹
(علامہ) صدر الدین شیرازی ــــــ ۹۳
(سلطان) صلاح الدین ایوبیؒ ــــــ ۱۸۱، ۲۴۲
صمصم بن عبد اللہ ــــــ ۱۱۶
ضیاء الدین بابا خانوف ــــــ ۱۹۳

ط
(مؤرخ) ابو جعفر طبری ـــــ ۹۶
(شیخ) طہٰ صابونجی ـــــ ۱۳۱
ظ
(ملک محمد) ظاہر شاہ ـــــ ۵۲
(سلطان) ظہیر الدین بابر ـــ ۳۵، ۳۶
ع
(حضرت) عیسیٰ علیہ السلام ۵، ۱۰۰، ۱۵۰، ۱۵۲
(ام المؤمنین حضرت) عائشہؓ ـــــ ۱۰۴
(سیدنا حضرت) علی کرم اللہ وجہہٗ ـ ۲۷، ۴۳، ۱۰۴
۱۰۵، ۲۰۵، ۲۳۱، ۲۴۳، ۲۹۳
(حضرت) عبداللہ بن رواحہؓ ۲۷۴، ۲۷۹
(شاہ) عباس صفوی ـــــ ۹۰، ۹۱
(ڈاکٹر) عباس مہاجرانی ـــــ ۸۲
(امیر) عباس ہویدا ـــــ ۸۱
(شیخ) عبدالباقی مجو ـــــ ۲۵۰
عبدالحکیم عابدین ـــــ ۱۳۲
(سلطان) عبدالحمید خان ـــــ ۲۳۲
(مولانا سید) عبدالحی حسنی ـــــ ۱۸
عبد خلعت ـــــ ۲۱۸، ۲۹۹
(وزیر) عبدالرحمن خان بخاری ـ ۱۹، ۲۵، ۲۹۱
(محمد) عبدالرحمن خلیفہ ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۴۸
(شیخ) عبدالمناف مالکی ـــــ ۲۱۸
(شیخ) عبدالرزاق فیاض ۹، ۱۸، ۱۱۱، ۱۹۲، ۲۰۳
(سید) عبدالرزاق کاکی ـــــ ۲۳۰
عبدالرزاق محی الدین ـــــ ۱۹۵
عبدالرسول سیاف ـــــ ۲۵، ۲۶، ۲۹
عبدالستار السید ـــــ ۱۷۹
عبدالستار سیرت ـــــ ۴۸
(مولوی) عبدالسلام مجددی ـــــ ۴۳
(مولوی) عبدالعزیز ـــــ ۴۴
(شیخ) عبدالعزیز خیاط ـــــ ۲۷۱
(حضرت شیخ) عبدالقادر جیلانیؒ ـ ۱۳۰، ۳۴۳،
۸۸، ۱۰۹، ۱۴۲، ۱۴۷، ۱۹۶، ۲۹۴، ۲۹۵
(شیخ) عبدالکریم ـــــ ۱۹۲
عبدالکریم قاسم ـــــ ۲۰۱
(ڈاکٹر) عبداللطیف تمال ـــــ ۲۱۸
(شیخ) عبدالمحسن سمان ـــــ ۱۳۲
عبدالہادی ـــــ ۳۰
عبدالہادی ہدایت ـــــ ۳۹
عبداللہ انصاری ـــــ ۴۲، ۱۳۱
عبداللہ باسری ـــــ ۱۳۱، ۱۸۴
(ملک) عبداللہ بن حسین ـــــ ۲۳۱، ۲۴۲
عبداللہ راجی ـــــ ۲۸۲
عبداللہ عباس ندوی ـــــ ۲۴۳، ۲۴۲، ۳۰۱
عبداللہ عزام ـــــ ۳۱۹ - ۲۸

(شیخ) عدنان الجبسر ـــــ ۱۳۹
عزالدین خطیب ـــــ ۲۱۹
(مولوی) عزیز الرحمن ـــــ ۲۳۳
عسجدی ـــــ ۴۸
(سلطان) علاء الدین حسین (جہاں سوز) ۴۴
(آقائے) علی اصغر حکمت ـــــ ۸۶
علی بابا ـــــ ۱۹۶
علی بن عیسیٰ ابو الحسن الربعی (امام نحو) ـــــ ۹۳
علی حسن قدوتی ـــــ ۱۳۱
(شیخ) علی الدقر ـــــ ۱۸۱
(امام) علی رضا ابن موسیٰ کاظم [illegible] ۲۰۳
علی صقر ـــــ ۱۸۹
(محمد) علی الطاہر ـــــ ۲۲۷
علی فرزی ـــــ ۲۱۹
(شیخ) علی الفوزان ـــــ ۲۵
(سید) علی لالا ـــــ ۵۰
(سیدنا) عمر بن عبدالعزیزؒ ـــــ ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۴۲
عمر خیام ـــــ ۹۰
عمرالموق ـــــ ۲۱۱
عنصری ـــــ ۴۸
(ڈاکٹر) عیسیٰ صدیق ـــــ ۴۴

غ

(امام محمد) غزالیؒ ـــــ ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۱۸۸

غفاری ـــــ ۴۸
غلام ربانی ـــــ ۲۳۴
غلام محمد نیازی ـــــ ۲۵، ۲۶، ۲۹
(امیر) غیاث الدین منصور ـــــ ۹۳

ف

فاضل طائی ـــــ ۱۹۵
(امیر) فتح اللہ شیرازی ـــــ ۹۳
(مولانا) فتح محمد جالندھری ـــــ ۲۰۹
(امام) فخرالدین رازی ـــــ ۸۳
فرخی ـــــ ۴۸، ۵۰
فردوسی ـــــ ۴۸، ۸۵، ۸۶
فرعون ـــــ ۲۱۳
(نورالمشائخ شیخ) فضل عمر مجددی (شیر آغا) [illegible]
(خواجہ) فریدالدین عطار ـــــ ۹۰
(شاہ) فیصل بن عبدالعزیزؒ ـــــ [illegible]
فیصل مولوی ـــــ [illegible]

ق

قانون ـــــ ۲۱۳
(شیخ) قاسم المصری ـــــ ۲۲۲
(سید) قطب شہید ـــــ ۲۷

ک ل

(سید) کامل الشریف ـــــ [illegible]
[illegible]

کامل شعشاری — ۳۹
کاظم زادہ — ۸۱
(آیت اللہ العظمیٰ سید) کاظم شریعتمداری
۸۳، ۸۴، ۱۳۳
(سلطان) کریم خان — ۹۲
(امام) کسائی — ۱۳۰
(مولانا) لطف اللہ علی گوسی — ۴۴

م

(حضرت) مریم علیہا السلام — ۱۰۴
(سیدنا) موسیٰ علیہ السلام — ۱۴۳
(حضرت) معاذ بن جبلؓ — ۲۴۰
مالک — ۲۳۸
(خلیفہ) مامون رشید — ۸۹
(شاہزادہ و امیر) متعب بن عبدالعزیز ۱۹۲
متمم بن نویرہ — ۲۳۸
مجتبیٰ — ۱۳۰، ۱۴۲، ۲۶۲
(حضرت) مجدد الف ثانیؒ کا خط برادر خورد کو
(شیخ) محمد اسلام تسلیم — ۲۵، ۳۹
(علامہ) محمد اسلم جیراجپوری — ۱۶
(شیخ) محمد امین شنقیطی — ۲۲۱، ۲۳۹
(شیخ) محمد برکات — ۱۴۳
محمد بن زکریا رازی — ۸۴
(ملک مصر) محمد علی پاشا — ۲۶۶
(ابو عبداللہ) محمد بن النصر المروزی ۲۰۵
محمد اسحٰق بجاوا — ۱۹۱
(شیخ) محمد الخضر حسین تونسی — ۱۸۱
(آیت اللہ مرزا) محمد خلیل کمرہ‌ای ۸۲، ۸۵، ۲۶۸
(مولانا) محمد رابع حسنی ندوی — ۱۲۱، ۱۸۱
(شیخ) محمد احمد الشبیلی — ۲۵، ۴۳، ۵۶
محمد سلمانی — ۲۸
(سلطان) محمد شاہ — ۸۸
(آغا) محمد شاہ — ۹۱
(ڈاکٹر) محمد صدیق — ۳۸
(مولانا) محمد صدیق کباری — ۳۱
محمد صفوت سقا — ۱۳۲
(شیخ) محمد علی حمز — ۱۳۴
محمد علی ضناوی — ۱۲۱، ۲۴۹
(مولوی) محمد گل — ۲۸، ۳۲
محمد مبارک — ۱۹۱
(ڈاکٹر) محمد ملکہ — ۸۲
(شیخ) محمد محمود الصواف — ۱۲۱
(شیخ) محمد مطلق — ۱۴۳
(ڈاکٹر) محمد موسیٰ آلانا — ۲۶
(ڈاکٹر) محمد موسیٰ شحتہ — ۲۸
محمد مشی — ۱۳۸، ۲۲۵، ۲۸۰
محمد سلامہ اتفاق — ۲۶۶

(شیخ الہند مولانا) محمود حسن ـــــ ۴۴
(سلطان) محمود غزنوی ـــ ۳۵، ۴۰، ۱۵۰، ۷۰، ۲۸
(شیخ) محی الدین ابن عربی ـــــ ۱۶۳
مروان ابن الحکم ـــــ ۱۶۴
(مسز راس) مسعود ـــــ ۲۱، ۲۵
(سلطان) مسعود بن محمود ـــــ ۳۹
مشہود حسن محمود ـــــ ۲۲۵
(ڈاکٹر) مصطفیٰ ـــــ ۲۳۹
(شیخ) مصطفیٰ احمد زرقا ـــــ ۲۳۴
مصطفیٰ کمال پاشا ـــــ ۲۰
معری ـــ ملاحظہ ہو ـــ ابوالعلا
(سیدہ) معصومہ ـــــ ۸۴
مقدسی ـــــ ۲۵۰
(شیخ سید) مکی الکتانی ـــــ ۱۸۰
(علامہ نورالدین) ملا علی قاری ـــــ ۴۲
ملالی (افغانی خاتون) ـــــ ۲۹
(ڈاکٹر) منوچہر ازموں ـــــ ۸۰-۸۲
منوچہری (فارسی شاعر) ـــــ ۴۸
(مولانا) مودودی ـــ ملاحظہ ہو ـــ ابوالاعلیٰ
(امام) موسیٰ کاظم ـــــ ۱۹۱
میر زاہد ـــــ ۱۸

ن

(ڈاکٹر) ناجی معروف ـــــ ۱۹۵
(جنرل محمد) نادر خاں ـــــ ۲۰، ۲۱
نادر شاہ افشار ـــــ ۴۳، ۸۸
(شیخ) ناصر الصباح ـــــ ۱۴۱
(مفتی شیخ) نجم الدین واعظ ـــــ ۱۹۲
(شیخ) ندیم الجسر ـــــ ۱۳۹، ۱۴۰
نذر الحفیظ ندوی ـــــ ۷۷، ۲۳۲
نصیر الدین طوسی ـــــ ۸۶
نظام الملک طوسی ـــــ ۸۶
(شیخ) نمر الخطیب ـــــ ۱۹۱
(علامہ) نورالدین علی ـــ ملاحظہ ہو ـــ ملا علی
نور عظیم ندوی ـــــ ۴۳
(حضرت) نورالشاہ گنج ـــ ملاحظہ ہو ـــ فضل عمر

و

(علامہ) وحیدی ـــــ ۸۴
(سلطان) ولید ـــــ ۱۳۰
ولید الاعظمی ـــــ ۱۹۵
(حضرت شاہ) ولی اللہ محدث دہلوی ـــــ ۱۹

ہ

(سید) ہادی خسرو شاہی ـــــ ۸۴
(خلیفہ) ہارون رشید ـــــ ۷۹، ۸۶، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۸۵، ۲۰۱
(شیخ محمد) ہاشم مجددی ـــــ ۳۸، ۴۳
ہامان ـــــ ۲۱۲

(ڈاکٹر) ہرزل —— ۲۳۲
ہرقل —— ۲۶۵

ی

(مورخ) یاقوت —— ۲۵۰
یزدگرد (شاہ ایران) —— ۶۲
(امام) یٰسین عظیم —— ۳۸
یسوع مسیح —— ملاحظہ —— حضرت عیسیٰ
(سید محمد) یعقوب ہاشمی —— ۱۲۵، ۲۸
یوسف عزالدین —— ۱۹۵
یوسف العظم

فرق و ملل

اثنا عشریہ —— [illegible]
اشاعرہ —— ۱۸۸
اہل سنت —— [illegible]
حنبلی —— [illegible]
حنفی —— [illegible]
سنی —— [illegible]
شافعی —— [illegible]
شیعہ —— [illegible]
[illegible] فرقہ —— [illegible]
مالکی —— ۱۰۳
مسیحی (عیسائی) —— [illegible]
معتزلہ —— ۱۸۸

اقوام و قبائل۔ نسل و خاندان

افغانی (اہل افغانستان) —— [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] —— ۲۱۳
[illegible] —— ۲۴۲
انگریز —— [illegible]
[illegible] —— [illegible]
[illegible]
اہل لیبیا —— ۱۴۰
اہل مغرب (یورپین) —— [illegible]
[illegible]
اہل ہند (ہندوستانی) —— [illegible]
بابلی —— ۱۱۹
[illegible] —— ۱۹
(قبیلہ) [illegible] —— ۲۶۵
(قبیلہ) بلی —— ۲۶۵

ترک ——— ۱۶، ۴۰، ۹۳، ۱۹۱، ۲۷۹
تغلق ——— ۱۶
(قوم) ثمود ——— ۲۳، ۲۴، ۲۷۸
(قبیلہ) جذام ——— ۲۷۵
جرمن ——— ۲۲۷
خاندان غلامان ——— ۱۶
خلجی ——— ۱۶
رومی ——— ۳۲، ۲۴۳، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۷۷
زید (خاندان) ——— ۹۲، ۹۳
سعودی ——— ۷۵، ۱۷۳، ۱۸۳، ۲۱۶، ۲۱۸
سلجوقی ——— ۱۹۶
سوری ——— ۱۶
شامی ——— ۱۳۹
صفوی خاندان ——— ۵۰، ۹۱، ۹۵، ۱۱۵
صلیبی ——— ۲۳۶
(قوم) عاد ——— ۲۱۳
عباسی ——— ۹۰
عبرانی ——— ۲۷۷
عجم (عجمی) ——— ۱۱۹، ۱۳۳، ۱۳۹
عرب (عربی) ——— ۲۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۷، ۱۰۱ - ۱۰۴، ۱۱۸
۱۱۹، ۱۳۳، ۱۳۹، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۰ - ۱۵۱
۱۵۵، ۱۶۳، ۱۷۷، ۱۹۷، ۲۰۳، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۳۳
۲۷۰، ۲۷۱ - ۲۳۹، ۲۷۹ - ۲۷۸
عیسائی ——— ۳۷، ۱۳۴، ۱۳۹ - ۱۴۷، ۱۶۵، ۲۲۳، ۲۲۵
۲۳۴
غزنوی ——— ۱۶، ۴۸
غوری ——— ۱۶، ۴۸
فرانسیسی ——— ۳۰، ۱۳۶، ۱۳۷
فرنگی ——— ۱۹۶
فلسطینی ——— ۱۳۷، ۲۲۴، ۲۲۹، ۲۳۱
قاچاری ——— ۸۳
(قبیلہ) قین ——— ۲۷۵
کتانی (حسنی سادات) ——— ۱۸۰
کردی ——— ۲۳۹
کشی ——— ۱۹۲
لبنانی ——— ۱۴۶ - ۱۴۹، ۱۵۱ - ۱۵۳، ۱۶۰، ۱۸۲
(قبیلہ) لخم ——— ۲۷۵
لودھی ——— ۱۶
مہدوی ——— ۴۲
مرہٹہ ——— ۱۸، ۱۹
مغل ——— ۱۶
نبطی ——— ۲۷۷، ۲۷۸
نصاریٰ ——— ۱۰۱، ۱۶۷
نوروزی (خاندان) ——— ۱۴۲
یونانی ——— ۳۳، ۲۷۷
یہود ——— ۱۰۱، ۱۵۸، ۱۶۷، ۲۲۳

سلطنتیں

بازنطینی سلطنت ـــ ۲۳۱
سلجوقی سلطنت ـــ ۸۹
سلطنت عباسیہ (عباسی خلافت) ۱۴، ۱۸۰، ۲۲۹
سلطنت عثمانیہ ـ ۳۲، ۱۳۲، ۱۳۹، ۲۳۱، ۲۳۳
غزنوی سلطنت ـــ ۹۴
مغل سلطنت ـــ ۴۵

ادارے اور تحریکات

(الف)
اخوان المسلمین ـــ ۱۳۲، ۲۳۷
ادارۂ اوقاف عمان ملاحظہ ہو وزارت
اردن یونیورسٹی ـــ ۲۲۹
آریہ مہر یونیورسٹی (تہران) ـــ ۸۲
ازہر لبنان ـــ ۳۳، ۱۴۲
اسپتال عمان ـــ ۲۲۵
اسلامی ثقافتی مرکز اردن کا ملاحظہ ہو مرکز اسلامی
اسلامی شفاخانہ طرابلس ـــ ۱۲۰
اسلامی یتیم خانہ بیروت ـــ ۱۳۳، ۱۳۹
اطلاعات و نشریات اردن ملاحظہ ہو محکمہ
امانت عامہ (جنرل سکریٹریٹ رابطہ) ۲۳، ۲۴
امریکن یونیورسٹی بیروت ـــ ۸۱، ۱۳۸
(ب)
بعث پارٹی (شام) ـــ ۱۷۳
بغداد یونیورسٹی ـــ ۱۹۳
بی۔ بی۔ سی لندن ـــ ۱۸۳
بیروت عرب یونیورسٹی ـــ ۱۵۳
(ت)
تبلیغی جماعت ـــ ۳۵
تہران یونیورسٹی ـــ ۸۴، ۸۶
(ج)
جامع ازہر ـــ ۲۷، ۴۹، ۵۵
جامعہ ملک عبدالعزیز (جدہ) ـــ ۴۴، ۱۵۳
جامعہ نظامیہ بغداد ـــ ۹۳
الجامعۃ الاسلامیۃ (البنان) ـــ ۱۹۲
جماعۃ عباد الرحمن (لبنان) ـــ ۱۹۱
جمعیۃ انقاذ فلسطین بغداد ـــ ۲۰۲
جمعیۃ تعلیم بنات المسلمین فی القری ـــ ۱۶۲
جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیۃ (بیروت) ۱۹۱، ۱۹۲
جمعیۃ رعایۃ الیتیم (صیدا) ـــ ۱۲۵
جمعیۃ العلماء (افغانستان) ـــ ۳۹

جمعیۃ العلماء (شام) ———— ۱۸۰
الجمعیۃ الغراء (دمشق) ———— ۱۸۱
جمعیۃ المحافظہ علی القرآن الکریم ———— ۱۹۳
جمعیۃ المقاصد الاسلامیہ (لبنان) ———— ۱۹۲

ح

حکومت اسرائیل ———— ۲۲۳
حکومت ایران ———— ۱۰۵
حکومت سوریہ ———— ۱۵۳، ۱۹۲
حکومت شام ———— ۱۶۹

د

دار الافتاء (لبنان) ———— ۱۳۲، ۱۵۲، ۱۵۸
دار التبلیغ الاسلامی (قم) ———— ۸۲، ۸۳، ۸۵
دار الحفاظ (کابل) ———— ۲۵
دار العلوم دیوبند ———— ۳۰
دار العلوم (کابل) ———— ۲۸، ۳۳
دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵
دار القلم (کویت) ———— ۲۳۶
دار السطول (ترکی) ———— ۱۲
دمشق یونیورسٹی ———— ۱۳۶
دیوان الاوقاف (لبنان) — ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۰۲

ر ز

رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) — ۹، ۱۰۰، ۲۲۳، ۲۳۲، ۲۳۱
۳۳، ۳۵، ۱۱۵، ۱۱۶، ۸۰، ۸۳، ۱۲۳، ۱۲۹، ۱۳۳
۱۵۳، ۱۶۵، ۱۸۰، ۱۹۳، ۲۱۸

رابطۃ العلماء ——— ملاحظہ ہو ——— جمعیۃ العلماء
رابطۃ العلوم الاسلامیہ (اردن) — ۲۳۹، ۲۴۹
زراعتی سکول (شوبک) ———— ۲۶۶

س

سعودی سفارتخانہ بغداد ———— ۱۰۹، ۱۸۵
" " دمشق — ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۶۳، ۱۶۹
" " کابل — ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۵۶، ۶۱
" " لبنان ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۴۸، ۱۴۹
سنٹرل وقف بورڈ کابل ———— ۳۱

ش

شام یونیورسٹی ———— ۲۸۰
شلتر (جرمن مشنری) ———— ۲۲۶

ع ف

عراقی حکومت ———— ۱۶۹، ۱۷۵
عراقی میوزیم ———— ۱۹۶
(ادارہ) علوم اسلامیہ تہران ———— ۸۳
عیسائی مشنری (بیروت) ———— ۲۲۵
فلاحی انجمن مرکز اسلامی (اردن) ——— ۲۲۶

ک

کابل یونیورسٹی ———— ۲۵، ۲۹، ۵۶، ۵۸
کتبخانہ ازہر لبنان ———— ۱۳۳
کلیۃ اصول الدین ازہر ———— ۲۶
کلیۃ الالہیات تہران ———— ۸۲، ۸۳

کلیۃ الشریعہ دمشق ـــــ ۱۲۵، ۱۲۶
" " شام ـــــ ۲۸۰
" " عمان ـــ ۲۳۹، ۲۷۵، ۲۸۰
" " کابل ـــ ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۲۸
" " مکہ مکرمہ ـــــ ۱۹۱
الکلیۃ العلمیۃ الاسلامیہ ـــــ ۲۵۱

(ل)

لائبریری مسجد احمد اوقاف ـــــ ۲۲۶
لبنان یونیورسٹی ـــــ ۱۵۳

(م)

مجلس اوقاف ـ عراق ـــــ ۱۸۹
مجلس شوریٰ حکومت سعودیہ ـــــ ۱۵۴
المجمع العلمی العراقی ـــــ ۱۹۴، ۱۹۵
المجمع العلمی الکردی ـــــ ۱۹۴، ۱۹۵
مجمع اللغۃ العربیۃ ـ دمشق ـــــ ۱۸۱
محکمۂ آثار قدیمہ ـ کابل ـــــ ۴۷
محکمۂ اطلاعات و نشریات ـ اردن ـــ ۲۱۹
محکمۂ اوقاف ـ ایران ـــــ ۱۰۵
محکمۂ اوقاف ـ لبنان ـــــ ۱۳۹، ۱۴۲
محکمۂ قضا و افتا ـ لبنان ـــــ ۱۳۹
مدینہ یونیورسٹی ـــــ ۲۳۰
مرکز اسلامی ـ اردن ـــ ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۷
مرکز التقریب بین المذاہب الاسلامیہ تہران ۸۲

مسلم تعمیر نفاذ ـ صیدا ـــــ ۱۲۵
(مطبع) مصطفی البابی الحلبی مصر ـــ ۲۰۴
[illegible] لندن ـــــ ۲۲۰، ۲۲۱
مکتب اسلامی ـ بیروت ـــــ ۱۹۱
مکتبۃ المسجد الاقصیٰ ـــــ ۲۲۶
ملالی گرلس کالج ـ کابل ـــــ ۲۹
مؤتمر اسلامی ـ دمشق ـــ ۲۲۷، ۲۳۹، ۲۴۵
مؤتمر عالم اسلامی ـ بیروت ـــــ ۱۴۶
مؤسسۃ الخدمات الاجتماعیہ ـ لبنان ـــ ۱۴۲

(ن)

(تحریک) ندوۃ العلماء ـــــ ۱۵۳
نقابت الاشراف ـ عراق ـــــ ۱۹۷
(مطبع) نولکشور ـ لکھنؤ ـــــ ۲۳۰
(محکمۂ) نیابت عامہ (حکومت کابل) ـــ ۳۹

(و) (ہ)

وزارت اطلاعات و نشریات ـ کابل ـــ ۳۸
وزارت اوقاف ـ ایران ـــــ ۸۰
وزارت الثقافت ـ عراق ـــــ ۱۹۷
" " عمان ـــ ۲۱۰، ۲۱۸، ۲۶۹
وزارت تعلیم ـ کابل ـــ ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۴۰
۴۳، ۴۷
وزارت خارجہ ـ بغداد ـــ ۱۹۰، ۱۹۳، ۱۹۵
" " لبنان ـــــ ۱۴۲

وزارت عدل۔ کابل — ۳۹
وزارت عظمیٰ۔ ایران — ۸۱
وزارت الیہ سعودیہ — ۲۲۳
الہیئۃ العربیۃ العلیا لفلسطین — ۱۳۶

کتابیات

الف

(سنن) ابن ماجہ — ۲۷۰
(سنن) ابوداؤد — ۱۰۱/۱۰۲
(سنن) احمد — ۲۷۰
(کتاب) آرامگاہ غزالی — ۸۷
(رسالہ) ازمۃ ایمان واخلاق — ۲۰۲
الاسفار الاربعہ — ۹۳
اشعیاہ — ۲۷۷
اکتشاف کہف اہل الکہف — ۲۵۰
الف لیلہ ولیلہ — ۱۸۸/۱۹۶

ب

بال جبریل — ۵۰
بخاری — ملاحظہ ہو — صحیح
البدایہ والنہایہ — ۲۸

ت

تاریخ دعوت وعزیمت — ۱۹۷
تاریخ ہندوستان — ۸۸
(تفسیر) ترجمان القرآن — ۹۳
ترجمۂ قرآن (شیخ محمد) — ۲۰۹
(سنن) ترمذی — ۲۶۹، ۲۷۰
(اخبار) تعمیر حیات — ۱۱
(تفسیر) تفہیم القرآن — ۹۳

ح

حاضر العالم الاسلامی — ۱۵، ۲۶
(رسالہ) حضارۃ الاسلام — ۲۸۰
حلیۃ الاولیاء — ۹۰، ۱۸۸
(رسالہ) الحیاۃ — ۱۸۳
حیاۃ محمدؐ — ۲۷۵

خ د

خطر الیہودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ — ۲۳۷
ڈائری معرکۂ فلسطین (عبداللہ التل) — ۲۳۷

ر

(جریدہ) الرائد — ۱۳۱
رد المحتار (شامی) — ۱۸۱
الرسالۃ المحمدیۃ — ۱۳۹، ۱۴۰
رسالہ سیرلاہ — ۱۸
روایات الاغانی — ۹۰، ۱۸۸
رودِ کوثر — ۱۲۹

س

سیرت ابن ہشام ـــ ۲-۱۱، ۷۹ ـ ۲۴۳، ۲۴۷

سیرت سید احمد شہید ـــ ۲۲، ۳۲، ۲۳، ۲۴۱

ش

شاہنامہ (فردوسی) ـــ ۸۵

شرح ہدایت الحکمۃ (صدرا) ـــ ۹۳

شعر العجم ـــ ۵۱

ص

صحیح بخاری ـــ ۱۰۴، ۲۹۹

صفۃ الصفوۃ ـــ ۱۸۸

صمصام الاسلام ـــ ۲۳۰

ط ع

الطریق الی مکۃ ـــ ۱۷۰

العرب والاسلام ـــ ۱۵۳

ف

فتوح الشام ـــ ۲۲۹

(رسالہ) الفکر الاسلامی تہران ـــ ۹۳

ق

قاعدہ بغدادی ـــ ۱۸۷

قصۃ الایمان بین الفلسفۃ والعلم والقرآن ۱۳۹

(کتاب) قیام اللیل ـــ ۲۰۵، ۲۰۹

ک گ ل

کتاب الاغانی ملاحظہ ہو روایۃ الاغانی

گلستان و بوستان ـــ ۹۳

(جریدہ) اللواء ـــ ۲۱۹

م

مدارج السالکین ـــ ۴۳

مذکرات سائح فی الشرق العربی ـــ ۱۱، ۱۸۱

مراصد الاطلاع ـــ ۸۶

(رسالہ) المراقب ـــ ۳۲

المسلمون فی لبنان مواطنون لا رعایا ـــ ۱۳۹

معرکۂ ایمان و مادیت ـــ ۲۴۹

مفردات غریب القرآن ـــ ۹۰

مکاتیب مجددی ـــ ۳۲

منازل السائرین ـــ ۴۳

من نہر کابل الی نہر الیرموک ـــ ۱۳

(سنن) موطا ـــ ۱۰۱

ن

نزہۃ الخواطر ـــ ۱۸

(سنن) نسائی ـــ ۲۲۹

نقوش اقبال ـــ ۵۰

و

وفیات الاعیان ـــ ۸۹

(حضرت شاہ) ولی اللہ کے سیاسی خطوط (خلیق احمد نظامی) ۱۹

ہ

(رسالہ) الہادی۔ ایران ـــ ۸۲

مقامات

الف

اٹلی ۔۔۔ ۵۳

ایلہ ۔۔۔ ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶

اردن ـ ۹، ۱۱، ۳۰ ـ ۳۹، ۱۴۲، ۱۴۶، ۱۹ ـ ۲۱، ۷۶

۲۲ ـ ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۳۹، ۲۴۳، ۲۴۴

۲۴۹، ۲۹۶، ۲۶۵، ۲۶۹

ازمیر ۔۔۔ ۲۴۹

اسرائیل ـ ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۴۲، ۱۴۸، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۸۵

اصفہان ۔۔۔ ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۸، ۹۰، ۹۱

(شمالی) افریقہ ۔۔۔ ۱۳۱

افسیس (افسوس) ۔۔۔ ۲۴۹

افغانستان ـ ۹، ۱۱، ۲۰، ۲۵ ـ ۱۱۵، ۱۲۸،

۳۳ ـ ۳۴، ۳۸، ۴۹، ۱۰۰، ۱۱۵ ـ ۱۱۶، ۱۱۸

۹۰، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۴، ۱۳۹، ۱۴۲

امریکہ ۔۔۔ ۵۵، ۱۲۷، ۱۳۲، ۱۸۸، ۱۹۹، ۲۳۴

ام القیس (بستی) ۔۔۔ ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴

اناطولیہ ۔۔۔ ۲۴۹

اندلس (اسپین) ۔۔۔ ۳۲، ۳۶، ۴۴، ۴۹

انگلینڈ ۔۔۔ ۱۷

انگورہ (انقرہ) ۔۔۔ ۱۲

(محلہ) الامام الاوزاعی (لبنان) ۔۔۔ ۱۳۳

ایران ـ ۹، ۱۱، ۲۳، ۲۷، ۵۱، ۶۳، ۷۱، ۷۲، ۷۴، ۷۷

۸۳ ـ ۸۴، ۸۶، ۸۸، ۱۰۵، ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۳۶، ۱۴۱

۹۵ ـ ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۲ ـ ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۸

۱۱۱، ۱۱۲ ـ ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۹
۱۳۰، ۱۳۹، ۲۴۲

ایشیا ۔۔۔ ۲۲، ۲۳، ۲۴۷

ایشیائے کوچک ۔۔۔ ۲۴۹

ب

بترا (البطراء، سلع) ۔۔۔ ۲۴۷، ۲۴۸

بحرین ۔۔۔ ۱۳۲، ۱۴۰، ۱۴۲

بخارا ۔۔۔ ۵۳

برطانیہ ۔۔۔ ۱۹

بصرہ ۔۔۔ ۲۰، ۸۸، ۱۴۸، ۱۷۲، ۱۸۴، ۱۸۷، ۲۱۸

بعلبک ۔۔۔ ۱۲۷، ۱۳۰

بغداد ـ ۲۷، ۶۸، ۷۴، ۷۶، ۸۵، ۹۸، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۰

۹۱ ـ ۹۲، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۲۸، ۲۰۴

۲۰۵، ۲۱۲، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۴۶

بقاع (لبنان) ۔۔۔ ۱۲۷، ۱۳۰

بقیع ۔۔۔ ۲۴۱

(محلہ) بگرامی (کابل) ۔۔۔ ۳۷

بلغار ۔۔۔ ۲۷۵

بلوچستان ۔۔۔ ۳۹

بیروت ـ ۲، ۱۲، ۲۲، ۸۱، ۸۳ ـ ۱۳۰، ۱۳۳
۱۵۳، ۱۶۲، ۱۷۸، ۱۸۴ ـ ۱۸۳، ۱۸۹، ۲۳۹

پ

پاکستان ـ ۳۴، ۳۷، ۴۷، ۵۸، ۱۷۰، ۱۹۸، ۲۱۸
پختونستان ـ ۴۹، ۵۳
پشاور ـ ۱۴۴
پٹھان ـ ۴۹، ۵۳

ت ٹ

تبریز ـ ۹۰
تخت جمشید ـ ۹۲، ۹۳
ترکی ـ ۱۴، ۲۴۹
تہران ـ ۵۸، ۸۵ ـ ۸۶، ۸۸، ۹۱، ۱۰۴
(ریاست) ٹونک ـ ۴۴

ج چ

جاکرتا ـ ۲۳۱
جدہ ـ ۲۳، ۱۴۲، ۱۵۳، ۱۹۱، ۱۹۵
جرش ـ ۲۳۱
جزیرۃ العرب ـ ۷۶، ۹۹، ۱۲۹
جسر (بغداد) ـ ۲۰۱
جولان (گولان) ـ ۱۶۸
چین ـ ۵۴، ۸۵

ح خ

حاصبیا ـ ۱۷۴
حبش ـ ۱۰۳
حجاز ـ ۱۹۸، ۲۳۲، ۲۴۸
حجر ـ ۲۴۸
الحضرۃ القادریۃ ـ ملاحظہ ہو ـ مقابر
حلب ـ ۱۴۹
حما ـ ۱۹۴
حمۃ ـ ۱۴۹، ۲۳۳
حمص ـ ۱۴۹
حیّ اکراد (دمشق) ـ ۱۴۳
خراسان ـ ۴۷، ۸۹

د

دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی ـ ۲۲۴
درۂ خیبر ـ ۱۹
دکلاک ـ ۲۳۸
دمشق ـ ۱۳۰، ۹۳ ـ ۱۲۰، ۷۰ ـ ۱۲۵، ۱
۶۵ ـ ۱۶۳، ۸۰ ـ ۱۶۸، ۸۳ ـ ۱۸۲
۱۸۹، ۲۱۳، ۲۱۹، ۲۲۷، ۲۴۳

ر

راشیا ـ ۱۷۴
رائے بریلی ـ ۲۲۴
رصافہ ـ ۱۳۰، ۲۰۱
رغدان (اردن) ـ ۲۳۱
رمادی (عراق) ـ ۱۹۲، ۱۹۳

روس ـــ ۱۹، ۵۴، ۵۵، ۱۷۸، ۱۹۱، ۱۹۳
روما ـــ ۲۷۸
رے ـــ ۸۳

ز

زبدانی ـــ ۱۸۰
زرقاء ـــ ۲۵۰
زرین نعل (تہران) ـــ ۱۲۹

س

ساحل (لبنان) ـــ ۱۳۷
سرحد ـــ ملاحظہ ہو ـــ صوبہ سرحد
سری لنکا ـــ ملاحظہ ہو ـــ لنکا
سعودی عرب ـــ ۲۳، ۵۶، ۵۸، ۱۳۱، ۱۵۴، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۴۷
سلط (اردن) ـــ ۲۴۰
سلطان پور ـــ ۱۹۴
سمرقند ـــ ۵۲
سندھ ـــ ۱۲۹
سوریا ـــ ملاحظہ ہو ـــ شام
سورت فلسطینی کیمپ ـــ ۲۴۲
سوئٹزرلینڈ ـــ ۱۳۷
سیر (طرابلس) ـــ ۱۴۰

ش

شارع ابونواس (بغداد) ـــ ۱۸۹
شارع شبلی ـــ ۱۹۵
شارع مطار (دمشق) ـــ ۱۷۸
شام ـــ ۹، ۴۷، ۱۱۹، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۰ ـ ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵ ـ ۸۱، ۲۴۳، ۲۶۵، ۲۶۸
شاغورہ (دمشق) ـــ ۱۲۵
شرق اردن ـــ ملاحظہ ہو ـــ اردن
شہاب ـــ ۲۷۷
(مقبرہ) شیخ محی الدین ابن عربی (دمشق) ـــ ۱۴۳
شیراز ـــ ۸۰، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۹۱ ـ ۹۵

ص ض

صوبہ سرحد ـــ ۲۴۴
صیدا ـــ ۱۳۴، ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۷
ضمانہ ـــ ۲۷۷

ط

طبران (طوس) ـــ ۸۶
طبریہ ـــ ۲۴۳
طرابلس ـــ ۱۳۴، ۱۳۸ ـ ۴۱، ۱۵۵
طرسوس ـــ ۲۴۹
طوس ـــ ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۸۹

ع

عراق ـ ۱، ۹، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۹۱ ـ ۹۲، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲

عمان ـ ۱۱، ۱۸۰، ۲۱۳، ۲۱۷ـ۱۹، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۳۹ـ۴۱، ۲۴۷ـ۵۰، ۲۶۵ـ۶۹، ۲۷۹

غ

غرناطہ ـــــ ۴۹، ۵۲
غزنی ـــــ ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۲
غزنین ـــــ ۴۴
غوطہ دمشق (تفریح گاہ) ـــــ ۱۲۸، ۱۶۳

ف

فرات ـــــ ۲۶۸
فرانس ـــــ ۳۰، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰
فرنگی محل ـــــ ۱۶۹
فلسطین ۹۴، ۱۲۹، ۱۳۴، ۲۲۷، ۲۳۸، ۲۴۷

ق

قاہرہ ـــــ ۱۱، ۴۳، ۱۳۸، ۲۲۶، ۲۴۷
قبرص ـــــ ۲۷۹
قرطبہ ـــــ ۴۹، ۵۲
قزوین ـــــ ۹۰، ۹۱
قم ـــــ ۸۲ـ۸۳، ۹۹، ۱۰۳، ۱۲۴
قندھار ـــــ ۳۹

ک

کابل ـ ۱۱، ۲۰ـ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۳۰، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۱ـ۴۷، ۵۳، ۵۶ـ۵۸، ۶۷، ۱۳۹، ۱۴۴، ۳۱۹
کاظمین (بغداد) ـــــ ۱۹۲
کراچی ـــــ ۲۳۱
کربلا ـــــ ۱۰۵، ۱۹۳، ۱۹۴
کرخ ـــــ ۱۳۰، ۲۰۱
کرک (اردن) ـــــ ۲۶۵، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۶
کشمیر ـــــ ۳۶
کوفہ ـــــ ۱۳۰، ۱۸۰، ۱۹۳
کویت ـــــ ۲۱۳، ۲۱۸، ۲۶۷
کہف الرجیب ـــــ ۲۵۰

ل

لاہور ـــــ ۲۲۳، ۲۳۴، ۲۳۹، ۲۴۷
لبنان ـ ۹۰، ۱۲۹ـ۳۱، ۱۳۲ـ۳۴، ۱۳۸ـ۳۹، ۱۴۲ـ۴۴، ۱۴۶ـ۵۰، ۱۵۴ـ۵۵، ۱۶۲ـ۶۳، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۸۰
لکسر ـــــ ۲۷۷
لکھنؤ ـــــ ۱۲، ۲۰، ۱۶۹، ۲۳۰
لندن ـــــ ۱۷، ۱۸۳
(سری) لنکا ـــــ ۲۲، ۱۱۳
لوی ـــــ ۲۳۸
لیبیا ـــــ ۱۳۹

م

ماسکو ـــــ ۱۹۱
مایار ـــــ ۲۷۰
مخیمات الحسن فلسطینی کیمپ ـــــ ۲۴۲
مدائن ـــــ ۱۹۴

مدائن صالح ـــ ۲۷۸
مدینہ منورہ ـــ ۱۸۷، ۲۷۵
مشہد (ایران) ـــ ۸۳، ۸۴، ۸۸ـ۹۰
مصر ـ ۳۹، ۵۵، ۹۳، ۱۰۳، ۱۱۹، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۴۲، ۱۸۱، ۲۲۱، ۲۷۳، ۲۷۸
معان (شام) ـــ ۲۷۵، ۲۷۶
مفرق ـــ ۲۰۱
مکہ مکرمہ ـ ۳۹ـ۴۰، ۴۲، ۴۴، ۵۳، ۸۱، ۱۰۵، ۱۴۷، ۱۸۰
ملتان ـــ ۲۰۹
منصوریۃ المتن (لبنان) ـــ ۱۲۹
موآب ـــ [illegible]
موتہ ـــ ۷۷ـ۲۷۳
(محلہ) میدان (دمشق) ـــ ۱۷۹

ن و

نجف ـــ ۱۰۵، ۱۹۲، ۱۹۳
نوقان (طوس) ـــ ۸۶
نیشاپور ـــ ۸۶، ۹۰
وادی عربہ ـــ ۲۷۷
ویٹیکان ـــ ۲۳۹

ہ

ہرات ـــ ۲۳۳
ہندوستان ـ ۱۴ـ۱۵، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۳۳، ۳۴، ۳۷، ۴۵، ۴۸،
۴۷، ۴۸، ۴۹، ۴۲ـ۴۳، ۵۳، ۵۵، ۵۹، ۵۹، ۵۸، ۶۰،
۶۸، ۷۳، ۷۶، ۸۱، ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۹۳، ۱۱۲، ۱۱۹،
۱۲۰، ۱۲۳، ۱۳۰، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۹۲، ۱۹۳،
۲۱۹، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۵
ہندوکش ـــ ۱۱۵، ۱۴۹

ی

یرموک ـــ ۲۱۱، ۲۴۲
یروشلم ـــ ۲۳۱
یونان ـــ ۷۹

مدارس و درسگاہ

جامعات و کلیات اور دار العلوم ملاحظہ ہوں ادارے و تحریکات

مدرسہ ابی حنیفہ ـــ ۲۸
مدرسۂ استقلال (کابل) ـــ ۳۰
مدرستہ الایمان (طرابلس) ـــ ۱۳۱
مدرسہ دار الحفاظ ـــ ۲۸
مدرسہ عبد القادر جیلانی ـــ ۱۹۳
مدرستہ الفتح الشافعیہ ـــ ۱۹۱
مدرسہ فتح پوری ـــ ۳۴
مدرستہ القرآن (اردن) ـــ ۲۴۰
مدرسۂ تقوی جواد ـــ ۲۴۳
مدرسہ مستنصریہ ـــ ۱۳۰
مدرسہ ناصریہ (ترکی) ـــ ۳۴
مدرسہ نوریہ ـــ ۱۳۰

خانقاہ

خانقاہ تقوی جواد ـــ ۲۴۲، ۲۴۳
〃 سیدنا جیلانی ـــ ۱۸۰

مساجد

بیت اللہ شریف ـــ ۱۲۹
مسجد نبوی ـــ ۱۲۹
بیت المقدس ـــ ۲۳۳، ۲۴۳، ۲۷۵

www.KitaboSunnat.com

جامع اموی ــــ ۱۴۳
جامع البناء (دمشق) ــــ ۱۴۳
جامع الشہداء ــــ ۱۹۱، ۲۰۲، ۲۰۳
جامع مسجد اردن ــــ ۲۲۲
جامع مسجد پل خشتی (افغانستان) ــــ ۴۴، ۴۵
جامع مسجد چہار باغ (اصفہان) ــــ ۸۴
شاہی مسجد تہران ــــ ۸۲، ۸۳
مسجد الزرقاء ــــ ۲۲۹
مسجد اردن یونیورسٹی ــــ ۲۲۹
مسجد امام ابی یوسف ــــ ۱۹۰
مسجد امام اعظم (بغداد) ــــ ۱۹۰
مسجد حضرت عبدالقادر جیلانی ــــ ۱۹۷
مسجد سپہ سالار (تہران) ــــ ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۱۰۳
مسجد سیدنا جعفر ابن ابی طالب ــــ ۲۴۹
مسجد سیدہ معصومہ ــــ ۸۳
مسجد شاہ عباس صفوی ــــ ۸۳
مسجد طرابلس ــــ ۱۳۶
مسجد مدرسہ ابی حنیفہ ــــ ۴۸
مسجد علوی جولا ــــ ۴۳
مسجد گوہر (مشہد) ــــ ۸۴
مسجد شیخ لطف اللہ ــــ ۸۴
مسجد شہید شرکسی (اردن) ــــ ۲۳۱
مسجد وکیل (شیراز) ــــ ۸۴

مقابر و مزارات

حافظیہ (مقبرہ خواجہ حافظ شیرازی) ــــ ۹۲
الحضرۃ القادریہ (مزار حضرت عبدالقادر جیلانیؒ) ۱۹۰، ۱۹۷
سعدیہ (مقبرہ شیخ سعدی) ــــ ۹۳
سلمان پاک (مقبرہ حضرت سلمان فارسیؓ) ــــ ۱۹۴
کاظمیہ ــــ ۱۹۱
مرقد حضرت حذیفہ یمانیؓ ــــ ۱۹۴
مزار امام علی رضا ــــ ۸۳، ۸۶، ۸۹، ۱۰۳
〃 امام غزالیؒ ــــ ۸۷
〃 جعفر بن ابی طالب ــــ ۲۴۶
〃 زید ابن حارثہؓ ــــ ۲۴۹
〃 سلطان صلاح الدین ایوبی ــــ ۱۸۰
〃 شیخ محی الدین ابن عربی ــــ ۱۴۳
〃 عبداللہ ابن رواحہؓ ــــ ۲۴۹
مقبرہ نادر شاہ افشار (طوس) ــــ ۸۸
مقبرہ امیر عبدالرحمن خان غازی ــــ ۴۵
مقبرہ بابر (کابل) ــــ ۴۶
〃 حکیم سنائیؒ ــــ ۴۹
〃 خواجہ بلغار ــــ ۵۰
〃 سلطان محمود غزنوی (غزنی شریف) ــــ ۵۰
〃 سید بہلول دانا ــــ ۵۰
〃 سید علی لالا ــــ ۵۰
〃 سیدہ معصومہ ــــ ۸۴، ۱۰۳
〃 شمس العارفین ــــ ۵۰

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۱۔۔۔ بے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر 11827

متفرقات

باغ وچمن
باغ چشمان ـــــــ ۹۳
چہار باغ (اصفہان) ـــــــ ۹۳
شالامار باغ ـــــــ ۴۶
کارنیر باغ ـــــــ ۴۶

دریا وسمندر
بحر روم ـــــــ ۱۳۹
بحر ہند ـــــــ ۲۲
بحیرۂ طبریہ ـــــــ ۲۴۴
دجلہ ـــــــ ۷۶، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۳
دریائے سندھ ـــــــ ۱۲۹
دریائے قیطرہ ـــــــ ۲۲۹
دریائے کابل ـــــــ ۱۱، ۴۹
دریائے یرموک ـــــــ ۱۱، ۲۳۳، ۲۴۳
فرات ـــــــ ۱۸۸

پہاڑ
جبل بحمدون ـــــــ ۱۳۲
جبل لبنان ـــــــ ۱۳۲، ۱۳۴
کوہ اطلس ـــــــ ۱۲۹
کوہ اندلس ـــــــ ۱۲۹
کوہ ہمالیہ ـــــــ ۱۵
کوہ ہندوکش ـــــــ ۱۲۹
گولان ۲۳۔۲۳۳

محل وعمارات وآثار
اسٹیڈیم جرش ـــــــ ۲۳۲
اہرام مصر ـــــــ ۹۳
تخت طاؤس ـــــــ ۹۸
قصر جمہوری (بغداد) ـــــــ ۱۹۰
قصر شاہی (اردن) ـــــــ ۲۲۱
محل زعفران (اردن) ـــــــ ۲۲۱
ہارونیہ (طوس) ـــــــ ۸۴

ہوٹل وقیام گاہ
امبیسیڈر ہوٹل (بغداد) ـــــــ ۱۰۹
انٹرکونٹیننٹل (اردن ہوٹل) ـــــــ ۲۱۸، ۲۴۹
پارک ہوٹل (تہران) ـــــــ ۸۱
پارس ہوٹل (شیراز) ـــــــ ۹۳، ۹۵
سرائے مشیر (شیراز) ـــــــ ۹۵
شیرٹن ہوٹل جبل بحمدون ـــــــ ۱۳۲
فندق امیہ الجدید (دمشق) ـــــــ ۱۴۳
فندق عمان ـــــــ ۲۲۸
مہمان سرائے شاہ عباس صفوی (اصفہان) ۹۱
جمشنا ہوٹل (تہران) ـــــــ ۸۲
ہوٹل بیروت ـــــــ ۱۳۲
ہوٹل شیراٹن ـــــــ ۲۰۸
ہوٹل کابل ـــــــ ۴۵، ۵۲، ۶۱

میوزیم
اسلامی میوزیم (موتہ) ـــــــ ۲۴۷، ۲۶۴
عراقی میوزیم ـــــــ ۹۶
میوزیم کاخ گلستان ـــــــ ۸۹

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

"... یہ سفرنامہ ان ممالک (افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن) کی زندگی کے مختلف گوشوں، ان کے مسائل و مشکلات، وہاں کی فکری، تہذیبی اور نفسیاتی کشمکش، اور ان کی رہنمائی کی ضرورتوں کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن گیا ہے، جس کی مدد سے ناظرین اور ان ممالک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو صحیح واقفیت اور ان ممالک کے حالات و حوادث کا صحیح ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ اس سفر کا آغاز افغانستان کے دارالحکومت کابل سے اور اس کا اختتام اردن کے دارالحکومت عمان پر ہوا، اس مناسبت سے مصنف نے کتاب کا نام "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" رکھا، یہ دونوں تاریخی دریا ان دونوں ملکوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اور ان سے ماضی و حال کے بہت سے تاریخی و اسلامی حوادث و حالات وابستہ رہے ہیں، اور جن کے درمیان قرن اول کے اسلامی فتوحات کے دھارے نے ربط و اتصال پیدا کر دیا تھا۔" (از مقدمۂ کتاب)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ